بھٹکتی نسلیں
خورشید قائم خانی

بھٹکتی نسلیں

خورشید قائم خانی

نام کتاب = بھٹکتی نسلیں
مصنف = خورشید قائم خانی
پبلشرز = فکشن ہاؤس
18_ مزنگ روڈ' لاہور
فون :7249218, 7237430
پروڈکشن = ظہور احمد خان / رانا عبدالرحمان
معاون = ایم سرور
پرنٹرز = زاہد بشیر پرنٹرز لاہور
سرورق = ریاظ
اشاعت = 1996ء
قیمت = -/100 روپے

فہرست

شیدی

عورت

ہاری ۔ کسان

دیس بدیس

تبصرہ

"بھٹکتی نسلیں"

(نیوز لائن انگریزی ماہنامہ- کراچی)

از حسن مجتبیٰ

خانہ بدوش، شیدی (سدی_ افریقی سندھی)، کسان اور عورتیں دھرتی کی کچلی ہوئی نسلوں میں شامل ہیں- زمانہ قدیم سے ہر دور میں انہیں کچلا گیا، بیوپاری کی اجناس کی طرح ان کا سودا کیا گیا اور ان پر ناگفتہ بہ ظلم ڈھائے گئے- مگر معاشی و سماجی اعتبار سے انسانیت کی نچلی ترین سطح پر زندہ رہنے والے یہ لوگ، تہذیبی و ثقافتی طور پر بلاشبہ امیر ترین کہلانے کے مستحق ہیں- ان کے گیت، ان کی ان کہی کہانیاں، ان کے ساتھ کی گئی ان گنت زیادتیوں کی طرح ان کے دل کی گہرائیوں میں دفن ہیں-

ماہر عمرانیات، انتھرا پولوجی کے مطابق کولھی، بھیل، میگھ واڑ، جوگی و نیز دیگر خانہ بدوش قبائل جن کا تعلق زیادہ تر راجستھان کے صحرا اور گجرات سے ہے، حقیقت میں برصغیر کی قدیم ترین نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں- ان کا خیال ہے کہ ان میں سے بیشتر کا تعلق دراوڑ نسل سے ہے جنہیں وادی سندھ کی تہذیب کے زوال پذیر ہونے پر آریہ حملہ آوروں نے غلام بنا لیا-

ان خانہ بدوشوں کو آج بھی سندھ کی دھرتی پر در بدر بھٹکتے دیکھا جا سکتا ہے- بہرحال سندھ کے نام نہاد سورما اور خود ساختہ وارثوں نے دھرتی کے ان قدیم ترین سپوتوں کو ابھی تک قبول نہیں کیا ہے- شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ موجودہ سندھی قوم پرست تحریک پر سیدوں اور بلوچوں کا غلبہ ہے جو حقیقت میں خود بھی حملہ آوروں کی صورت میں یہاں وارد ہوئے تھے-

شیدی گو اپنی خداداد صلاحیتوں، خوش کن کرداروں اور اپنے روح پرور، سریلے ناچ

گیتوں کے ذریعہ اعلیٰ طبقہ کی محفلوں میں اپنے لئے جگر تو بنا لیتے ہیں، مگر ان کی تاریخ، ان کی مسخ شدہ زندگیوں کی طرح تعصب کا شکار ہے۔ وہ اب بھی سیدوں اور بلوچ رئیسوں (سندھ کے دوہرے حکمران) کے گھروں اور دروں پر کسمپرسی کی حالت میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

ان افتادگان خاک انسانوں کے بارے میں تحقیق و تحریر کے لئے خورشید قائم خانی سے موزوں شاید ہی کوئی اور ہو، کیونکہ وہ راجستھانی خانہ بدوش بھی ہے اور انتھرو پولوجی کا شائق بھی۔ "بھٹکتی نسلیں"، حقیقت میں خورشید کے ان انگریزی مضامین کا مجموعہ ہے جو اس نے کراچی کے انگریزی روزنامہ "اسٹار" کے لئے لکھے تھے ____

اس کتاب کے کئی ایک رخ ہیں ____ ایک طرف یہ سفر نامہ بھی ہے تو دوسری طرف، بھٹکتی نسلوں پر بصیرت کے ساتھ کی گئی گہری تاریخی تحقیق بھی۔ عمرانیات کے نقطہ نگاہ سے بیشک یہ مقالے تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس لئے بھی کہ اس سے پہلے کسی نے ان پر قلم اٹھانے کی زحمت گوارا نہیں کی۔

قائم خانی اپنے ذاتی تجربہ کی بنیاد پر زندہ اور متحرک لوگوں کے بارے میں لکھتا ہے ____ اس نے اپنی زندگی کے بیش بہا لمحات بھیلوں، کولہیوں اور شیدیوں کے ساتھ کبھی صحرائی اور کبھی شہری جھونپڑیوں اور کٹیاؤں میں گزارے ہیں۔ اس نے فوج میں میجر کے عہدہ سے استعفیٰ دے کر سچائی کو قلمبند کرنا شروع کر دیا۔ وہ اس ترتیب میں ٹورانٹو یونیورسٹی میں منعقدہ بین القوامی جپسی کانفرنس میں شرکت کے لئے کناڈا بھی پہنچا جہاں اس نے بین القوامی جپسیوں اور دیسی خانہ بدوشوں کی لسانی و ثقافتی بنیادوں پر تقابلی مقالہ بھی پڑھا ____

"بھٹکتی نسلیں"، زمانہ کے ان ستائے ہوئے لوگوں کی زندگی پر ایک طائرانہ نظر ڈالتی ہے ____ قائم خانی ان کی ستم ظریفوں کے ساتھ ساتھ ان کی جدوجہد زندگی کے مثبت پہلوؤں کو بھی اجاگر کرتا ہے۔ مثلاً سندھ کی ایک چھوٹی سی گوٹھ میں پیدا ہونے والی شیدی لڑکی شاہدہ کی کہانی پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ مجموعی اعتبار سے "بھٹکتی نسلیں"، خورشید قائم خانی کی حیرت انگیز، بامقصد اور کامیاب تصنیف ہے جو عام ڈگر سے ہٹ کر ہے۔

تبصرہ

"جاگو" سندھی روزنامہ۔ کراچی

از اسحاق منگریو

ہم روزمرہ زندگی میں اکثر ان لوگوں سے حقارت بھرے انداز میں دور کھسک جاتے ہیں، جن کا خورشید قائم خانی نے اپنی کتاب "بھٹکتی نسلیں" میں اتنا لگاؤ کے ساتھ مشاہدہ کیا ہے اور جس کی مثال پاکستان میں اس سے پہلے نہیں ملتی۔ معاشرہ کے دھتکارے ہوئے ان خانہ بدوشوں کی خوشیوں، محبتوں، چنچل مسکراہٹوں رسم و رواجوں، ان کی رنگا رنگ پوشاکوں اور ناچ گیتوں کا تاریخی طور پر جائزہ لے کر انہیں اپنی کتاب میں ایک بہت ہی خوبصورت انداز میں سمویا ہے۔

وہ اس ترتیب میں حیرت انگیز طریقہ پر ان کا پیچھا کناڈا میں ٹورانٹو یونیورسٹی کی جپسی کانفرنس سے لے کر میکگل یونیورسٹی اور نیویارک کی خطرناک بستی ہارلیم کی گلیوں تک کرتا ہے۔ اور اس کام میں بیشک وہ اپنی کتاب اور بھٹکتی نسلوں کی طرح یکتا ہے۔

خورشید ہماری تاریخی بے حسی کو چھو کر ان اچھوتوں کے بارے میں ہمیں سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ زمانہ کے کن اوقات اور تاریخ کے کن ادوار میں یہ لوگ بھٹکنے پر مجبور کئے ہوں گے۔ اس کا انداز بے حد سادہ ہے اور الفاظ دل موہ لیتے ہیں۔ وہ پوچھتا ہے کہ کیا انسان کو در بدر کی ٹھوکریں کھانے کا بھی شوق ہو سکتا ہے؟ نہیں، کبھی نہیں۔ انسان ہمیشہ بھٹکنے پر مجبور کئے جاتے ہیں۔ کہیں یہ خانہ بدوش اچھوت ہیں، تو کہیں افریقہ سے لائے ہوئے حبشی (سدی) غلام۔ کہیں بدنصیب عورتیں ہیں، تو کہیں بے بس کسان۔ غرض کہ بنگلا دیش کے چکما قبائل سے لے کر امریکہ کے ریڈ انڈین قبائل تک وہ جہاں کہیں گیا، خورشید نے نہ صرف ان سے بلکہ اپنے قلم سے بھی وفا کی ہے۔

اس نے یہ مضامین ڈرائینگ روم کی قالین یا لائبریری کی کرسیوں پر بیٹھ کر نہیں لکھے

ہیں، بلکہ اس نے ان کی خاطر گھاٹ گھاٹ کا پانی پی کر اور ان کے غموں اور خوشیوں میں شریک ہو کر لکھے ہیں۔ یہ قبروں سے کھودی ہوئی لوک کتھائیں نہیں ہیں بلکہ زندہ و جاوید لوگوں کی جینے کی تڑپ اور ان کی جدوجہد کی سچی کہانیاں ہیں جو قارئین پر گہرا افسانوی رنگ چھوڑ جاتی ہیں۔ یہ کتاب ایسے موضوعات پر مشتمل ہے، جنہیں اس سے پہلے کم سے کم اردو اور سندھی زبان میں کسی نے نہیں چھوا۔ یہ بھی سچ ہے کہ اگر انسانیت نے انہیں چھوا ہوتا تو پھر یہ لوگ دنیا بھر میں بھٹکتے اچھوت نہ ہوتے۔

مگر خورشید قائم خانی کی نظر سطح سے نیچے جھانک کر ہمیں بتلاتی ہے ــــــ "جوگی دھیرج مزاج، بااخلاق، پرامن اور دلکش فنکارانہ تہذیب کے امین ہوتے ہیں اور یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ زمانہ قدیم میں ان کا تعلق ضرور کسی انتہائی ترقی یافتہ تہذیب سے رہا ہو گا"۔

وہ موجودہ نسلی بنیادوں پر تقسیم شدہ، شہر، حیدر آباد، سندھ کے عین بیچ پچیس (25) گھروں کی ایک جوگی بستی کو مثال بناتا ہے، جو ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی۔ جو اردو، سندھی، گجراتی اور مارواڑی تک سب زبانیں بولتے ہیں۔ مگر ان لوگوں کا میل جول، قرب و محبت اور ایک دوسرے کے ساتھ رواداری کی ایسی مثال کہ ہمارے نام نہاد اعلیٰ اور مہذب سماج میں ڈھونڈنے سے نہیں ملتی۔

کہنے کو میرے دل میں بہت کچھ ہے، مگر میں یہاں اتنا کہنے پر اکتفا کروں گا کہ ایسی کتاب اس سے قبل کسی نے سندھی یا اردو میں نہیں لکھی اور خورشید قائم خانی کی یہ منفرد کوشش قابل ستائش ہی نہیں بلکہ مبارک باد کی مستحق ہے۔ امید کرتا ہوں کہ یہ محض ابتدا ہے اور خورشید قائم خانی اپنے قلم سے ابھی ہمیں بہت فیض بخشے گا۔

جوگی

یوں تو ریگستان کی بیشتر آبادی خانہ بدوشوں کی سی زندگی گزارتی ہے مگر اصل خانہ بدوش وہ جوگی ہیں جو صحرا میں اڑتی ہوئی دھول کی طرح ہر وقت رواں دواں رہتے ہیں۔ اور شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ ہمارا صحرا اب بھی ایک ایسے انسانی عجائب گھر کی مانند ہے جہاں لوگوں کو آج بھی ان کے قدیم چال ڈھال میں دیکھا یا پرکھا جا سکتا ہے۔ یعنی سماجی انتھرو پولوجسٹوں کے لئے ایک جنت!

گو جوگی غالباً اس دھرتی کے قدیم ترین اور اصل سپوت ہیں مگر صدیوں ہی سے دھرتی ان پر تنگ رہی ہے۔ لق و دق بیابانوں میں ان کے جتھے یوں چلتے دکھائی پڑتے ہیں جیسے ان کے پیچھے دشمن کی فوجیں لگی ہوئی ہوں اور وہ رات بِتانے کے لئے ہر روز کسی نئی کمین گاہ کی تلاش میں سرگرداں ہوں۔

جلتے سورج۔ تپتی ریت۔ اور وقت کی بھٹی نے جلا کر انہیں کالے ناگ کی طرح سیاہ کر دیا ہے اور جس کے سہارے وہ جیتے ہیں۔ کم عمری ہی میں ان کے بچوں اور عورتوں کے چہروں پر ایک عجیب سی گھمبیرتا چھا جاتی ہے۔ اور بڑی عمر کے جوگی تو جیسے ہر گھڑی گیان دھیان میں جتے ہوں۔ فطرت کی قربت نے انہیں فلسفیوں کی سی سنجیدگی بخش دی ہے۔

کبھی ہمیں خیال آیا کہ یہ جوگی کون ہیں؟ اور سارے وقت جنگلوں اور صحراؤں میں یوں مارے مارے کیوں پھرتے ہیں۔ کیا انسان کو بلاوجہ بھٹکنے اور رلنے کا بھی شوق ہو سکتا ہے۔ اور وہ بھی ننھے ننھے بچوں کو جھولیوں میں تھامے جو اکثر پڑاؤ ڈالنے سے پہلے ہی چلتی حالت میں پیدا ہو جاتے ہیں۔؟ نہیں، انسان کو بھلا انسانیت کے بارے میں سوچنے کی فرصت ہی کہاں!

سانسی (سنیاسی) شامی (سوامی)۔ بانورے۔ بنجارے، گنوارے۔ گاڈے لوہار۔ کوچے۔ کنجر۔ چنگڑ۔ کبوترے۔ گرگلے۔ سپیرے۔ اور شکاری ان کے چند ایک حقیر قبائلی نام ہیں جو زمانے نے پہچان کے طور پر ان پر تھوپ دئے ہیں۔ ان کے بچے گداز اور پیارے اور ان کی چھریرے اور سڈول بدن کی عورتیں سانولی اور حسین ہوتی ہیں۔ ان کی آنکھیں سیاہ

اور چمکیلی۔ سانپ کی مانند ساکت اور ہرنی کی مانند بڑی بڑی اور گول گول معصومیت سے لبریز ہوتی ہیں۔ بلاشبہ یہ دراوڑ نسل کے لوگ ہندوستان کے قدیم ترین باشندے ہیں۔ شاہ لطیف نے ان کی منظر کشی یوں کی ہے۔

سنیاسیوں کی پہلے دن
کی جو پرکھ پروڑ
پل بھر کو آرام نہ تھا
تھے درد سے ہر دم چور
پیڈ تو سدا کہے
ہیں سنیاسی میں سور (درد)
جوگی سنگ ضرور
چھپتے پھریں لوک میں۔

راجستھان میں پیدائش کے ناطے جوگیوں سے میرا رشتہ بہت پرانا ہے۔ اور پھر بچپن کی کچھ یادیں تو ذہن پر ہمیشہ کے لئے دھندلے پرامنٹ نقوش چھوڑ جاتی ہیں۔

لمبی لمبی مونچھوں اور مانگ بھری داڑھی والا ہیرا ناتھ ایک بڑے سے سپیرے قبیلے کا بوڑھا اور بارعب سردار تھا۔ ساون کے بادلوں کی طرح ہر سال وہ بارش سے پہلے گاؤں میں آکر پڑاؤ ڈالتا۔ سینکڑوں اونٹ اور گدھے گاؤں کے اردگرد چرتے ہوئے اس قبیلے کی آمد کا پتہ دیتے۔ اور پھر ایک دن گاؤں بھر میں جشن کا سا سماں ہوتا ____ سانولے اور حسین جوگی کانوں میں بڑی بڑی پیتل کی بالیاں لٹکائے۔ پاؤں میں گھونگھرو باندھے۔ درجنوں کی تعداد میں بین بجا کر ایک مسحور کن ناچ دکھاتے۔ مارواڑ کی صحرائی دھن میں اتنی ساری مورلیوں اور بیناؤں کی آواز فضا میں ایک جادو سا بکھیر دیتی۔ اور جب پدم ناگ بین کی حرکت پر اپنی ٹوکریوں میں ڈولنے لگتے تو جوگی بھی سانپوں کی طرح لہرا کر بل کھاتے ہوئے ایک گول دائرے میں تھرکنے لگتے۔ جوگیوں کے ان دلکش ناچوں میں کتنی جاذبیت۔ ہم آہنگی۔ توازن اور تناسب تھا۔ گاؤں کے ٹھاکر ہیرا ناتھ کا شایان شان استقبال کرتے اور عزت و احترام کے ساتھ اپنے پہلو میں بٹھلاتے۔ یہ سپیرے فخر کے ساتھ اپنے کو چوہان کہلواتے اور گورکھ ناتھ یا گوگا چوہان کی منت مانتے جو غالباً سانپ پوجا کے دیومالائی اوتار تھے۔

بچپن ہی میں کھو جانے کے بعد میں بھی ایک طویل عرصہ تک جوگیوں کی مانند سچائی کی

تلاش میں بھٹکتا رہا ہوں۔ اور اب بھی جب میں جوگیوں کے ان پراسرار قافلوں کو اپنی دھن میں مگن رواں دواں دیکھتا ہوں تو گویا میری روح بھی ان کے ساتھ ہی چل دیتی ہے۔ اور میں مبہوتی کے عالم میں کھڑا دیر تک ان کو اپنے ہی پیروں سے لپٹی ہوئی گرد کے پیچھے گم ہو جانے کا دردناک نظارا کرتا ہوں۔ اور میری روح اس وقت تک واپس نہیں لوٹتی جب تک وہ دور کہیں افق سے اس پار ابدیت کی بے پایاں دنیا میں غائب نہیں ہو جاتے۔

قدیم تاریخ کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ دریائے سندھ کی دراوڑی تہذیب کوئی 1000 سال قبل مسیح کے لگ بھگ نہ صرف زوال پذیر ہو چکی تھی بلکہ شاید سماجی ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی۔ غالبًا اسی اندرونی انتشار کا سہارا لے کر آریہ حملوں آوروں نے ہندوستان کو اپنا نشانہ بنایا۔ قدیم آبادی نے ایک طویل عرصہ تک وحشی آریاؤں کے حملوں کا مقابلہ کیا۔ مگر آریہ قبائل جو بہتر ہتھیاروں سے لیس تھے بار بار حملہ آور ہو کر بالآخر ان قدیم دراوڑی باشندوں کو غلام بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ جنگجو دراوڑ قبائل جنھوں نے دشمن سے مصالحت نہ کی.وہ شمال میں پہاڑوں، مشرق میں صحرا اور جنوب کے جنگلوں میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے ____ مگر زیادہ تر ان کا ارتکاز راجستھان کے مغربی صحرا۔ کچھ بھوج کی دلدلوں اور گجرات کی پہاڑیوں میں ہوا۔ جہاں بہت وسیع قدرتی پناہ گاہیں تھیں۔ راجپوتوں یا کھتریوں کے نام سے جنگجویانہ دیومالائی تاریخ حقیقت میں انہی دراوڑی قبائل کی آریاؤں کے پھیلاؤ کے خلاف جدوجہد کی تاریخ ہے ____ گو کہ بالآخر بیشتر دراوڑی راجاؤں نے شکست دکھا کر نہ صرف آریاؤں سے مصالحت کر لی بلکہ شادی بیاہ کے رشتوں میں منسلک ہو کر اپنے آپ کو آریہ کہلوانے لگے۔ مگر دراوڑی عوام کے ایک بڑے حصے نے آریاؤں سے نہ صرف مصالحت کرنے سے انکار کیا بلکہ قسم اٹھائی کہ جب تک دشمن سے آزادی حاصل نہ کریں گے چین سے نہیں بیٹھیں گے اور خانہ بدوشوں کی سی زندگی پر اکتفا کیا۔ ان دراوڑی خانہ بدوش یا نیم خانہ بدوش قبائل نے صدیوں اس قسم کو نبھایا ہے ان میں کچھ ایسے قبائل بھی تھے جو حوصلہ ہار کر بیٹھ رہے اور یا پھر مذہب تبدیل کر کے حاکم الوقت کے ساتھ مل گئے۔

بالآخر صدیوں کی خانہ بدوشی۔ بھوک اور ذلت کے مارے ہوئے لوگوں کو وقت کے سنگدلانہ دھارے نے اپنے اندر سمو کر ہمیشہ کے لئے بھلا دیا اور وہ تاریخ میں گم ہو گئے۔ مگر ان کے لاشعور نے مقصدیت کی ایک مخصوص سمت میں بھٹکتی ہوئی خانہ بدوشی کی چال کو جاری رکھا۔ اور اب وہ محض بھٹکتی اور خاموشی پر اکتفا تو کرتے ہیں مگر یوگ اور تیاگ بھری

زندگی کو چھوڑنے پر تیار نہیں۔ اور اس وقت تک نہیں چھوڑیں گے جب تک کہ انسانیت ان کے درد بھرے احساسات کو چھونا نہ سیکھ لے۔ شاہ لطیف نے ان کی بے بسی کی اس کیفیت کا نقشہ یوں کھینچا ہے۔

بیٹھ کر بیراگیوں کا سنا۔

دوجے دن جو حال

پھٹے چیتھڑے دھول اٹے

جسموں پر تھا زوال

جان بوجھ کر جٹائیں چھوڑیں

چوٹے اچھلتی چال

بیچارے اپنے وجود کا

کس کو دیویں حال۔

ننگ دھڑنگ ہی نہال۔

چھپتے پھریں لوک میں۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا آج کی دنیا میں جوگی کی مقصدیت میں کوئی منطق باقی ہے؟ بالکل ہے! کیونکہ درد کے رشتے کبھی بلامقصد یا بے منطق نہیں ہوتے۔

جوگی قدیم زمانہ ہی سے ہمارے لئے سچائی کے پیغامبر رہے ہیں۔ وہ ہر وقت چلتے رہتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ بنی نوع انسان نے تباہی کی جو ڈگر اپنا لی ہے اس پر وقت اب ختم ہو رہا ہے۔ آج کی وحشت ناک اور نفرت انگیز دنیا میں جوگی ہمیں امن۔ محبت اور شانتی کا آئینہ دکھاتے ہیں۔ ایک ایسی دنیا میں جو آہستہ آہستہ عبرت ناک تباہی کی طرف کھسک رہی ہے۔ جوگیوں کا امن و آشتی بھرا پیغام نوشتۂ دیوار کی طرح صاف ہے۔ فطرت کی طرف لوٹ آؤ اور یا پھر ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاؤ۔

سپیروں کے نقش قدم پر

خانہ بدوش لوگ عام طور پر شہری لوگوں کو پسند نہیں کرتے۔ ان کی نظر میں شہر کے لوگ حریص۔ بد اخلاق اور انتہائی خود پرست ہوتے ہیں۔ شہری آبادیاں بھی خانہ بدوشوں کو حیوانوں کی سطح سے بالاتر نہیں سمجھتے ان دونوں ہی گروہوں کے درمیان لاشعوری طور پر بیگانگی اور بے اعتنائی کا رشتہ قائم رہتا ہے۔ زندگی کے بارے میں بھی ان کا رویہ ایک دوسرے کے ساتھ زیادہ میل نہیں کھاتا۔ شاید اسی لئے جوگی اکثر اوقات اپنے ڈیرے شہر سے ہٹ کر کسی سنسان مقام پر لگاتے ہیں۔

کچھ عرصہ ہوا کہ میں سانگھڑ ضلع کے اندرونی دیہات میں ایک دوست سے ملنے گیا۔ راستے میں دور ایک جانب کچھ گدھے چرتے نظر آئے غیر ارادی طور پر میرے قدم اس جانب مڑ گئے۔ وہاں پہنچ کر میں نے دیکھا کہ جن جھاڑیوں میں گدھے نظر آ رہے تھے وہ جھاڑیاں نہیں تھیں بلکہ جوگیوں کے ڈیرے تھے جو اس طرح بنائے گئے تھے جیسے کوئی فوج دشمن کے توپ خانہ یا ہوائی حملہ سے چھپنے کے لئے بناتی ہے۔ سوکھی گھاس پھوس اور جھاڑیوں سے بنے یہ ڈیرے ایک گول دائرے پر محیط دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ موسم سرد تھا اور کھنک ہوا تیز جھکڑوں میں چل رہی تھی کیونکہ ایک رات قبل اس علاقہ میں موسم سرما کی پہلی بارش ہوئی تھی۔ بستی کے چاروں طرف تھور اور سیم کی وجہ سے ہر طرف پانی بھرا تھا۔ قریب جانے پر میں نے دیکھا کہ جوگیوں کے ڈیرے لحاف و دیگر گرم کپڑوں کے لوازمات سے بالکل خالی تھے۔ ایسی صورت میں ان جوگیوں نے بارش کی سرد رات کیسے بسر کی یہ امر میرے لئے دیر تک معمہ بنا رہا۔

اتنے میں کالی اور چمکیلی آنکھوں والے چند بچے میرے گرد جمع ہو گئے ان کا شور سن کر کچھ جوگی بھی باہر نکل آئے اور رام رام کر کے ہم وہیں زمین پر بیٹھ کر خوش گپیاں کرنے لگے۔ میں چونکہ تھوڑی بہت مارواڑی زبان بول لیتا ہوں اس لئے جوگیوں سے میل جول بڑھانے میں مجھے کوئی زیادہ دقت نہیں ہوتی۔

تھرپارکر میں عمر کوٹ اور اکھی راج کے مقام پر جوگیوں کی دو بڑی بستیاں ہیں۔ ان

جوگیوں نے لوئر سندھ کے علاقے کو چند سیکٹروں میں بانٹ رکھا ہے۔ موسم سرما کی آمد کے وقت ان کے چھوٹے چھوٹے جتھے اپنے متعین شدہ راستوں پر سالانہ گشت کی صورت میں نکل پڑتے ہیں۔ اور پھر ایک بڑے دائرے کی شکل میں ان کی یہ پھیری بالا آخر آئندہ ساون کی بارشوں کے وقت پھر سے عمر کوٹ اور اکھی راج پر آ کر ختم ہوتی ہے۔ جہاں مل جل کر پھر سے وہ ایک قبیلہ بن جاتے ہیں۔ سال بھر کے شکوے شکایت اور لڑائی جھگڑے طے ہوتے ہیں۔ ضرورت محسوس ہو تو پھر سے نئے سردار کا چناؤ کرتے ہیں۔ اور پھر سال بھر کی کمائی سے اپنے لڑکے لڑکیوں کی بیاہ شادی کرتے ہیں یا مرن پرن کی رسم ادا کرتے ہیں۔ اور ساون کے خاتمے پر موسم سرما کی آمد کے ساتھ پھر سے بچھڑ کر چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں اپنی اپنی راہ لیتے ہیں۔ کچھ ٹکڑیاں ہنگلاج اور گوادر کا طواف کر کے واپس آتی ہیں۔ کچھ جوگی ایران اور دیگر عرب ممالک تک جا کر واپس آتے ہیں۔ اور کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو کئی سالوں بعد واپس آتے ہیں یا پھر کبھی واپس نہیں آتے۔

اگر کوئی اہل دل جوگیوں سے یہ سوال کرے کہ وہ زہریلے سانپوں کو کندھوں پر اٹھائے۔ دکھ اور درد بھری کٹھن زندگی اپنائے۔ بین کے تیکھے اور لہریے دار سروں سے روح کی دنیا گرمائے اتنی لگن اور بندھن کے ساتھ۔ اتنی دور دور تک کیوں مارے مارے پھرتے ہیں تو جوگی اس سوال کا کوئی قابل قبول جواب نہیں دے پاتے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس سوال کے صحیح جواب کے لئے ہمیں اپنی کم سے کم پانچ ہزار سالہ پرانی تاریخ کی پیچیدہ یا ڈھکی چھپی سماجی، ثقافتی و معاشی بنیادوں پر مبنی نسلی گتھیوں کو سلجھانا پڑے گا۔ جب تک اس تاریخی سچائی کو کھود کر گڑے مردے کی طرح نکالا نہیں جائے گا اور جب تک انسان کے ساتھ انصاف نہیں ہو گا وہ اسی طرح تلاش میں در بدر بھٹکتا اور رلتا رہے گا۔ مگر مصالحت نہیں کرے گا۔ مگر یہ دیکھتے ہوئے کہ جوگی کتنے دھیرج مزاج۔ بااخلاق پرامن، دلکش اور فنکارانہ شخصیت کے مالک ہوتے ہیں اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ زمانہ، قدیم میں ان کا تعلق کسی ترقی یافتہ تہذیب و ثقافت سے ضرور تھا۔ اور اس امر کی نشان وہی ان کے رنگ دار لباسوں۔ خوبصورت اور نفیس زیورات۔ لوک کتھاؤں اور روح پرور گیتوں سے بھی صاف عیاں ہے۔

اتفاق سے بارش کی رات بستی میں ایک بچہ پیدا ہوا تھا۔ لہٰذا اسی شام وہ اس کی خوشی منانے والے تھے۔ اس طرح خوشی کے اس موقع پر میں ان کا بن بلایا مہمان بن گیا۔ سپیرے جب اپنے لئے ناچیں گائیں اور بین بجائیں تو بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ ایسے

ماحول میں وہ سانپوں کی بجائے خود کو محسور کرنا پسند کرتے ہیں۔

سرد اور اندھیری رات کا طلسم توڑنے کی سعی میں وہ ایک کھلے میدان میں آگ کا بڑا سا الاؤ جلا کر اس کے گرد جمع ہو گئے۔ دور کسی اندھیرے کونے سے الو کی ایک خوفناک چیخ نے سنسان جنگل میں محفل کی شروعات کرنے کا اعلان کیا۔ اس کے فوراً بعد سپیرے جوگی نے منہ پھلا کر بین پر پھڑکتا سا سر نکالا۔ چوڑی چکلی چھاتی والے چاندی نے ڈفلی بجا کر اس کا ساتھ دیا اور سماں باندھا ارجن جو دبلا پتلا سانولا کوئی دس سال کا لڑکا تھا بین کے سامنے آلتی پالتی مار کر گانے کے لئے بیٹھا تو بالکل ناگ لگتا تھا ارجن نے بائیں کان میں انگلیاں ٹھونس کر بین اور ڈفلی کے ساتھ آواز ملا کر اونچے سر میں ایک گیت الاپا۔ بول بلاشبہ راجستھانی تھے اور جیسے جیسے بین کے سر لہریے کی صورت میں تھرتھراتے ہوئے تیز ہوئے اور ارتعاش کو پہنچے تو سپیرے جوگی واہ واہ کی آوازیں نکالتے نہ صرف جھومنے لگے بلکہ اردگرد کی فضا مستی میں مدہوش اور ناچتی محسوس ہوئی۔

بہرے اور گونگے سانپ اپنی پٹاریوں میں بند پڑے تھے اور کسی نے بھی ان کی طرف دھیان نہیں دیا۔ مصری جوگی جو قبیلے کا سردار تھا بڑے تزک و احتشام کے ساتھ مجمع کے بیچ غیر معمولی سنجیدگی کے ساتھ بیٹھا تھا۔ جیسے جیسے چاندی اور ارجن نے بول دہرائے تو میں نے چند ایک بول پکڑ لینے کی کوشش کی جو یوں تھے:

دریا ٹوٹے تو گنڈو لگاواں
مہارے جی رو گنڈو نہیں رے لاگے
پہلکی روٹی سیکاں ہے ہاڈے نے دیواں
کھاؤ رے ہاڈا مہارے ہتھ ری میزبانی
مہارو بیرو باو ڑلیا
کاکو رے بڈو بائی ٹکاں رولو بھی
بائی نے جائے برنائی پردیس
ہو کا وے آج مہانیں ماوڑی جایو بیرو
بائی نے جائے پرنائی پردیس

ایک اور گیت کے بول کچھ یوں تھے۔

متی رے کڑپے، مہاری ماتاڑی
متی رے کڑپے مہارا بابلیا

متی رے کڑپے مہاری ماوڑی
بائی رے،ملک ری گاڈی چھٹی جائے
بائی رو لکھیو لیکھ پردیس

رات کو دیر تک محفل گرمی رہی اور انہوں نے بہت سے گیت سنائے۔ زیادہ تر یہ گیت عورت کی تنہائی اور اس کے دکھوں کے بارے میں تھے۔ جو اسے گھربار اور قبیلے سے دور سسرال میں جھیلنے پڑتے ہیں۔ مہندی نام کے ایک گیت میں بہت ہی مٹھاس، جاذبیت اور رومانیت تھی۔ عورتوں کے بارے میں اتنے دکھ بھرے گیت گانے کے باوجود سپیروں کی ان محفلوں میں عورت کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ اس عرصہ میں عورتیں الگ تھلگ ڈیروں میں گھر کا کام نپٹاتی رہیں۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سپیرے جب دن بھر بین بجاتے دور نکل جاتے ہیں تو ڈیرے اور بچے عورتیں ہی سنبھالتی ہیں۔ جہاں ایک طرف ان کی عورتیں حسین اور جاذب نظر تھیں تو دوسری طرف ڈیرے ہر وقت سندھ کی بڑی بڑی جاگیروں سے گھرے ہوئے ہوتے۔ اور جاگیرداروں کی نظریں جوگی عورتوں کی طرف شاذ و نادر ہی ہوس سے خالی اٹھتی ہیں۔ بہرحال جب آدھی رات کو یہ محفل ختم ہوئی تو جوگیوں اور سانپوں کے بیچ میں نے بھی بقیہ رات ان سے خوش گپیاں کرتے گذاری۔ صبح ہوئی تو میں نے دیکھا کہ ایک ڈیرے کے سامنے ایک بڑا سا سفید کتا کھڑا ہے۔ اور ایک ننھا منا سا بچہ جو اپنے سہارے کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کتے کا سہارا لے کر کھڑا ہوا ہے۔ اور کتا بھی یوں ساکت کھڑا تھا۔ جیسے اس کو احساس ہو کہ اگر وہ ذرا ہلا تو بچہ گر جائے گا۔ جوگی اور کتے کی زندگی کے درمیان کتنی باریک سی لکیر تھی۔ سانپ تو جیسے ان کے سر کا زیور تھے پتلے سانپ کو ناک میں ڈال کر منہ کے راستے باہر نکالنا تو ان کا معمولی سا کرتب تھا۔ انسان اور حیوان کے درمیان فطری اور حسین امتزاج صرف جوگیوں کے ڈیروں ہی میں نظر آتا ہے۔

سانپوں کے شکاری

میں نے ایک دن اسے کراچی میں زینب مارکیٹ کے سامنے تیز دوڑتی ہوئی کاروں کے درمیان سڑک عبور کرتے ہوئے دیکھا۔ اس کے سڈول کندھوں پر ایک لمبے بانس کے سہارے جوگیا رنگ کی دو بھاری اور متوازن جھولیاں لٹک رہی تھیں۔ اس کا لمبا جسم بوجھ کی وجہ سے کچھ جھک سا گیا تھا۔ اس کے باوجود وہ ناچنے والے کی سی پھرتی کے ساتھ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اور کاروں سے بچتا بچاتا صاف نکل گیا۔ سڑک کے اس پار اس کا نشانہ چند غیر ملکی گورے سیاح تھے جو خراماں خراماں چلے آ رہے تھے۔ اس نے جھٹ سے اپنی جھولی ان کے راستے پر بچھا کر سانپوں کی پٹاری کا ڈھکنا کھولا اور ہاتھ مار کر ایک اونگھتے ہوئے ناگ کو چھیڑ کر جگانے کی کوشش کی اور اس کے بعد منہ پھلا کر بین بجاتے ہوئے کالے ناگ کے سامنے جھولنا شروع کر دیا۔ اس سارے کرتب کا مطلب لمحہ بھر کے لئے ان غیر ملکیوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانا تھی۔ تین گورے آدمی اور ایک عورت جو غالباً یورپی ملاح تھے یا سٹیل مل کے روسی بڑی بے اعتنائی کے ساتھ سپیرے کا نوٹس لئے بنا گزر گئے۔ مگر عورت نے سانپ پر ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر کراہت سے منہ بناتے ہوئے نظریں دوسری طرف پھیر لیں۔

جوگی بھی اسی بے اعتنائی اور سنجیدگی کے ساتھ آہستہ آہستہ سانپوں کی پٹاری کو پھر سے بند کر کے جھولی میں ڈالنے لگا۔ میں بھی اس عرصہ کے دوران سڑک عبور کر کے اس کے پاس پہنچ چکا تھا اور اس کے چہرے کا تاثر لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ سپیرے نے بھی کھسیانی سی ہنسی ہنس کر میری طرف یوں دیکھا جیسے وہ میرے خیالات بھانپ گیا تھا۔ "یہ غریب روسی تھے۔ امریکی خاصے فراخ دل ہوتے ہیں!" کھیمو نے جھینپ مٹاتے ہوئے کہا۔

ہاں! اس کا اصلی نام کھیمو ہی تھا اور وہ ٹھٹھہ کے قریب مکلی کی بڑی جوگی بستی کا رہنے والا تھا۔ مگر کراچی میں وہ اپنا نام ہاشم بتلاتا تاکہ شہر والوں کے نسلی اور چھوت چھات بھرے تعصب سے چھٹکارہ پا سکے۔ عام جوگیوں کے مقابلہ میں وہ بہت ہی کھلے دل کا باتونی سا نوجوان تھا اور ہم فوراً ہی ایک دوسرے سے گھل مل گئے۔ ہاشم کے کہنے کے مطابق اس

نے نہ صرف کراچی ٹیلیویژن پر بین بجانے کے پروگرام کیئے تھے بلکہ چند سندھی' اردو فلموں میں کام بھی کر چکا تھا۔ مجھے متاثر کرنے کے لئے اس نے چند فلمی مکالمے بھی سنائے اور اداکاری کے پینترے بھی دکھائے۔ مگر بیشتر وقت وہ زینب مارکیٹ کے اردگرد ہی گزارتا جہاں غیر ملکی سیاح اور ملاحوں کی بڑی تعداد دوکانداری کے لئے آتی اور وہ بین بجا کر اور سانپ دکھا کر اپنی گذران کرتا۔ دوپہر ہو چلی تھی۔ ہم باتیں کرتے کرتے سڑک کے کنارے ایک نان چھولے فروش نانبائی کے پاس بیٹھ کر کھانا کھانے لگے۔ سڑک پر گزرتے ہوئے کچھ لوگوں نے ہم پر اچٹتی سی ایک نظر ڈالی جو وہ اچھوتوں اور حیوانوں کو غلط جگہ پر پا کر ڈالتے ہیں۔

بلا کسی جھجھک اور تکلف کے ہاشم نے مجھے سپیروں کے بارے میں کچھ کھری کھری باتیں سنائیں جو میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں سنی تھیں۔ اس نے کہا کہ سپیرے مجمع لگا کر سانپوں کے علم کے بارے میں جو باتیں کرتے ہیں ان میں کوئی سچائی نہیں ہوتی۔ وہ محض پیٹ پالنے کے لئے یہ سارا ڈھونگ رچاتے ہیں۔ اس نے بتلایا کہ جوگیوں کے پاس زہر قاتل کے طور پر کوئی زہر مہرہ یا زہر مار منکا یا منتر نہیں ہوتا۔ اور اگر زہریلا سانپ سپیرے کو کاٹ کھائے تو اس کو وہ سب خطرات لاحق ہوتے ہیں جن سے ایک آدمی گزرتا ہے۔ "تو پھر سپیرے اس آسانی سے سانپوں کو پکڑ کر رام کیسے کر لیتے ہیں۔" میں نے حیرانگی سے پوچھا۔

"اس لئے کہ صدیوں سے سانپ پکڑ کر پیٹ پالنا ہمارا دھندا ہے۔ نسل در نسل یہ کام کر کے جو ہم بچپن ہی سے شروع کر دیتے ہیں عبور حاصل ہو جاتا ہے۔ مہارت ہو جاتی ہے۔ ہمارے ہاتھوں کی حرکت سانپ کی حرکت سے زیادہ تیز ہوتی ہے۔ اور ہم اس کو ڈنگ کھائے بغیر پکڑ لیتے ہیں۔ اور پکڑنے کے بعد اس کے نچلے جبڑوں کے چار زہریلے دانت نکال دیتے ہیں۔ بس سانپ بے ضرر ہو جاتا ہے اور یہ ہمارا کمال نہیں بلکہ اصل فن ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"سپیروں کو اکثر اوقات سانپ ڈس لیتے ہیں۔ اور اس کا فوری علاج یہ ہوتا ہے کہ بدن کے متاثرہ حصے کو فوراً رسی یا کپڑے کی پٹی سے باندھ دیا جائے اور پھر ڈنگ کی جگہ چیرا لگا کر زہر آلود خون کو منہ سے چوس کر باہر نکال دیا جائے تاکہ بدن میں نہ پھیل سکے۔ اگر سپیرا اکیلا ہو اور سانپ ایسی جگہ ڈس لے جہاں جوگی کا ہاتھ یا منہ نہ پہنچ پائے تو وہ ایسی حالت میں مر جاتا ہے۔ اسی لئے جوگی اکثر جوڑی کی صورت میں پھیری پر چلتے ہیں۔ خاص

طور پر اگر مسافرت طویل ہو اور راستے میں سانپوں کا خطرہ ہو۔ مجھے درجنوں بار سانپ نے ڈسا ہے اور میری جان اسی طرح بچی۔ مگر ایک بار میں اکیلا تھا اور تقریباً مرنے لگا تھا۔ اس بار میری جان ٹھٹھہ کے گورنمنٹ ہسپتال کے ڈاکٹر رانا سنگھ نے بچائی۔"

میں حیرانی سے اس کا منہ تکتا رہا۔ کیونکہ اس سے پہلے میری یاد میں کسی سپیرے نے اس قدر صاف گوئی سے کام نہیں لیا تھا۔

"بھائی" اس نے کہا اگر یقین نہیں آتا تو میرے ساتھ مکلی چلو جہاں ہماری بہت بڑی بستی ہے اور آس پاس کی جنگ شاہی کی پہاڑیوں میں سندھ کے بہترین ناگ ملتے ہیں۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ تمہارے سامنے تازہ ناگ پکڑ کر پورا عمل دکھلا دیں گے۔" اس نے کہا۔

چوپڑی اور دو دو! میں بھی فوراً تیار ہو گیا اور کچھ دیر کے بعد میں اور کھیمو جو اب بھائی بن کے تھے جی۔ ٹی۔ ایس بس میں بیٹھے ٹھٹھہ کے لئے روانہ تھے۔ جب ہم مکلی پہنچے تو رات ہو چکی تھی۔ جوگی بستی میں مکلی کے قبرستان (Necropolis) کی طرح ابدی خامشی چھائی ہوئی تھی۔ چند سرکیوں کی بنی ہوئی ٹوٹی پھوٹی جھگیوں سے گزرتے وقت بستی کے چند کتوں نے ہمارا سواگت کیا۔ اندھیرے کونے میں ہم ایک جھگی کے سامنے جا کر رکے۔ کھیمو اندر گیا اور آواز دی "بھائی اندر آ جائے۔"

جھگی کے اندر ایک کونے میں اس کی بیوی۔ بیٹی اور ساس زمین پر بچھی چٹائیوں پر لیٹے تھے۔ دوسرے کونے میں اس کا سسر اور جوان سالا لیٹے ہوئے تھے۔ باقی جھگی کچھ پرانے بوریہ بستروں اور سانپوں کی پٹاریوں کے علاوہ خالی خالی سی تھی۔ قریب ہی رسی سے ایک نیولا بندھا تھا۔ ان کے درمیان میں میرے لئے ایک چٹائی بچھا دی گئی اور جیسے ہی میں اس پر براجمان ہوا تو نیولے نے قریب آ کر میرا جائزہ لیا۔ جوگن نے اٹھ کر چولہا جلایا اور ہمارے لئے کھانا تیار کرنے لگی۔ اتنے میں آس پاس کے جوگیوں کو ہماری آمد کی اطلاع ہو گئی اور وہ ایک ایک کر کے سلام کلام کے لئے پہنچنے لگے اور ہماری کچہری جم گئی۔ ان جوگیوں میں سب سے دلچسپ سپیرا لونگ جوگی تھا۔ جو مکلی کے جوگی قبیلے کا سردار تھا۔ لونگ کی عمر اس کے اندازے کے مطابق 123 برس تھی مگر اس کے تمام دانت ابھی ثابت تھے اور لکڑی کے سہارے جھک کر چل پھر لیتا تھا۔ اس کے گلے میں عقیق، کہرے اور پکھراج کی موٹی سی مالا پڑی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ دھیمی آواز میں باتیں کرتا اور بیچ بیچ میں رک کر سانس لیتے ہوئے بالکل سانپ کی طرح زور سے پھنکارتا ____۔

لونگ نے بتلایا کہ ان کا اصل دیش راجستھان تھا اور پاکستان بننے سے پہلے ان کا قبیلہ اکثر جنگ شاہی کی پہاڑیوں میں کالے ناگ پکڑنے کے لئے آتا۔ ایک دفعہ جب وہ آئے تو ان کے واپس لوٹنے سے پہلے ہی ہندوستان کا بٹوارا ہو گیا اور درمیان میں سرحد کھنچ گئی اور وہ یہیں رک گئے اور اب ان کے قبیلے کے لوگ مکلی کی بستی کے علاوہ ٹھٹھہ اور بدین کے اضلاع میں دور دور تک پھیل گئے ہیں۔ 1949ء میں اس نے ایک امریکی ہرپٹیو لوجسٹ ڈاکٹر مشن کے ساتھ کام کیا اور بعد میں پورے قبیلے نے تریاق زہر(venom serum Anti)بنانے والی فیکٹری کو تحقیق کے لئے سانپ پکڑ کر سپلائی کرنے شروع کر دیئے۔ یہ فیکٹری بعد میں اسلام آباد منتقل ہو گئی۔ چونکہ ان سانپوں کو اسلام آباد پہنچانے کا نظام ناقص تھا لہٰذا ان سانپوں کی بڑی تعداد راستے ہی میں مر جاتی اور سپیروں کو خاطر خواہ معاوضہ نہیں ملتا۔ نتیجہ کے طور پر بیشتر سپیرے ٹھیکداروں کی بد دیانتی کی وجہ سے ان کے مقروض ہو گئے۔ "اصل میں ہمارے قبیلے نے سانپوں کو بیچ کر پاپ کمایا اور ہمارے اوتار ہم سے ناراض ہو گئے" لونگ نے بتلایا "اس طرح ہمیں بددعا لگ گئی۔ شاید اسی لئے اب ہمارے قبیلے کی حالت عمر کوٹ کے جوگیوں کے مقابلہ میں خاصی خستہ حال ہے اور وہ جوگی اب ہم سے کوئی راہ و رسم بھی نہیں رکھتے گو اب ایک طویل عرصہ سے ہم نے سانپوں کی تجارت کا دھندا چھوڑ دیا ہے مگر اس کا کفارا ابھی ادا کر رہے ہیں" لونگ نے میرے منہ پر بڑا سا پھنکارا مارتے ہوئے کہا۔

میرے پوچھنے پر لونگ نے بتلایا کہ برصغیر ہند و پاک میں صرف پانچ اقسام کے سانپ زہریلے ہوتے ہیں۔ بقیہ 75 فی صد سانپ بے زہر اور بے ضرر ہوتے ہیں۔ مگر لوگ ان سب کو زہریلا سمجھ کر مار دیتے ہیں۔ لونگ کے مطابق پانچ زہریلی قسم کے سانپ یہ ہیں۔ 1- کوبرا' کالا ناگ' رجمو' گوگویا پدم اس کے لئے کہاوت ہے کہ پدم نہ لے قدم۔ 2- کریٹ جسے سندھی میں کراڑیا بلا بھی کہا جاتا ہے۔ 3- ار سٹلر۔ اس کے جسم سے ٹک ٹک کی آواز آتی ہے۔ 4- رسل وائپر۔ اسے جوگیوں کی زبان میں ڈمر اور بھاؤن بھی کہتے ہیں۔ 5- لونڈی۔ یہ جھاڑیوں میں رہنے والا چھوٹا سانپ ہوتا ہے جس کا کاٹا پانی نہیں مانگتا۔ اسے جلیبی یا پراڑ بھی کہتے ہیں۔

جوگیوں کے ساتھ سانپوں کے بارے میں دیو مالائی کہانی قصے دیر تک چلتے رہے اور میں سانپ اور نیولے کے بیچ اپنے آپ کو پوری طرح محفوظ محسوس کرتے ہوئے یہ خیال کر کے کہ اگلی صبح سویرے سانپوں کے شکار پر جانا ہے سو گیا۔

دوسرے دن چائے پراٹھے کے گرم گرم ناشتہ کے بعد ہم کھیمو، جومو، لالو اور جیتو کے ساتھ ایک بس میں بیٹھ کر جنگ شاہی کی پہاڑیوں کی طرف روانہ ہوئے۔ جیتو کوئی بارہ سال کا لڑکا تھا اور اس نے شکار تھامنے کے لئے جھولی اٹھا رکھی تھی۔ لالو تکڑے بت قد کا تھا اور اس کی عمر کوئی بیس سال ہو گی اور اس نے ہاتھ میں زمین کھودنے کا رمبہ اٹھا رکھا تھا۔ جومو بھی اس کا ہم عمر ہی لگتا تھا۔ ٹھٹھہ اور جنگ شاہی کے درمیان ناریجو گوٹھ کے مقام پر ہم نے بس گاڑی چھوڑ دی اور سڑک کے دائیں طرف زمردی رنگ کے گندم کے لہلہاتے کھیتوں میں داخل ہوئے چند ایک ہاری کسان کھیتوں میں پانی دے رہے تھے انہوں نے ہماری طرف نہ تو کوئی توجہ دی اور نہ ہی وہ یہ جانتے تھے کہ انہی کھیتوں میں سے ہم کالے ناگ پکڑنے والے تھے۔ کھیتوں کے بیچوں بیچ اونچے بندھوں والا پانی کا ایک بڑا سا کھالا گزرتا تھا جس کے کنارے گھاس سے ڈھکے ہوئے تھے۔ جیسے ہی ہم ان کناروں کے نزدیک پہنچے تو کھیمو اپنے جسم کو سکیڑ کر اور آگے کی طرف جھک کر آہستہ آہستہ نالی کے کناروں کا معائنہ کرتے ہوئے اس طرح بڑھنا شروع ہوا جیسے شکاری کتا خرگوش یا پرندے کے ظاہر ہونے سے پہلے چلتا ہے۔ یا پھر بلی چوہے پر پل پڑنے سے پہلے حرکت کرتی ہے۔ اپنے ہاتھوں سے گھاس ہٹاتے ہوئے اس نے کناروں کے ساتھ گھاس میں چھپے ہوئے بلوں کا بغور جائزہ لینا شروع کر دیا۔

"تمہیں پتہ ہے بھائی" کھیمو نے سرگوشی کے انداز میں مجھے کہا۔ "سانپ بھی خانہ بدوشوں کی سی زندگی گزارتے ہیں۔ وہ اپنا بل نہیں بناتے۔ وہ زیادہ تر چوہوں اور چھپکلیوں کے بلوں میں رہتے ہیں۔ یا پھر پرندوں کے گھونسلوں کی تلاش میں اور انہی کے انڈوں پر گزارا کرتے ہیں۔ زیر زمین ان بلوں میں ان کی اپنی ایک دنیا ہوتی ہے اور سانپ اندر ہی اندر ایک بل سے دوسرے بل میں داخل ہوتے رہتے ہیں اور چوہے چھپکلیاں کھاتے رہتے ہیں۔" کھیمو نے ایک بل کا غور سے جائزہ لیتے ہوئے کہا "اس بل میں ناگ ہے۔" "تمہیں کیسے معلوم؟" میں نے بل کو گھورتے ہوئے پوچھا۔ کھیمو نے بل کے منہ پر مٹی کے ذروں پر کسی چیز کی حرکت کے نشانات کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی۔ مگر میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ پھر اس نے اس بل کے منہ کے نزدیک سے سانپ کی کینچلی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ڈھونڈ نکالے جو تازہ تھے۔ اس نے فاتحانہ انداز سے مسکراتے ہوئے ہلکے سے کہا۔" اب سمجھ میں آیا؟ یہ ان کا لباس بدلی کرنے کا موسم بھی ہے۔"

جومو اور لالو نے بل کو کھودنا شروع کر دیا جو ٹیڑھی۔ میڑھی بھول بھلیوں کی طرح کئی

سارے بلوں سے گزرتا نیچے کی طرف چلتا گیا۔ کھیمو کھودی ہوئی مٹی کو اپنے ہاتھوں سے ہٹا کر اصل بل کی سیدھ قائم رکھتا گیا۔ کوئی بیس منٹ کی تگ و دو کے بعد جوگی کوئی چار فٹ گہری زمین کھود چکے تھے۔

"ہوشیار!" اچانک کھیمو خوشی سے ناچ اٹھا۔ "بس اب گوگا ظاہر ہونے والا ہے۔" اس نے تیزی سے مٹی ہٹاتے ہوئے زمین میں گھنڈی مار کر دبکے ہوئے ایک کالے سانپ کو ظاہر کر دیا۔ سانپ جو کھیمو کے مطابق سپنی تھی خوف کے مارے چند ساعت اسی حالت میں پڑی رہی اور پھر یکلخت گھیرا توڑ کر ہمارے بیچ سے بھاگنے کی کوشش کی۔ مگر کھیمو نے کمال پھرتی اور چابک دستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہاتھ کی ایک ہی جنبش سے سپنی کو بدن کے پچھلے حصہ سے پکڑ کر اوپر اٹھا لیا اور سپنی بے بسی کے عالم میں اس کے ہاتھ میں جھولنے لگی۔ میں نے دیکھا کہ سپنی کھیمو کی گرفت میں اس قدر خوف زدہ تھی کہ اس کا معدہ بہہ نکلا اور اس نے ایک پچکاری سی مار کر کھیمو کے کپڑے پیلے کر دیئے۔ جیتو نے اپنی جھولی کا منہ کھولا اور کھیمو نے سپنی کو جھولی میں ڈال دیا اور پھر جیتو نے بڑی بے اعتنائی کے ساتھ اس جھولے کو اپنے کندھے پر یوں پھینک دیا جیسے اس میں زندہ سانپ کی بجائے مرا ہوا تیتر ہو۔

جوگیوں نے اپنا کام پھر سے شروع کر دیا۔ کھیمو ایک بڑے سے بل کے سامنے آ کر رک گیا جو میرے حساب سے غالباً لومڑی کا تھا۔ اس نے رمنبہ کی ضرب سے بل کو کچھ چوڑا کیا اور پھر اس میں ہاتھ ڈال کر ایک بڑی سی گوہ (Monitor Lizard) جس کو گوہیرو بھی کہتے ہیں باہر نکال لیا۔ اس کے بعد کھیمو نے گوہ کو دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں پکڑ کر اس کی ریڑھ کی ہڈی پر ایسا جھٹکا دیا کہ وہ بے حس اور مفلوج (Paralyse) ہو گئی۔ اس نے اسے زمین پر پھینک دیا اور وہ بے حس و حرکت چاروں شانے چت پڑی رہی جیسے مر گئی ہو۔ اس کے بعد گوہ بھی جیتو کے جھولی کے دوسرے خانے میں محفوظ ہو گئی۔

"اس کا کیا کرو گے؟" میں نے کھیمو سے پوچھا

"اسے سنڈے کا تیل بیچنے والے پٹھان بڑے شوق سے خریدتے ہیں۔ ورنہ اسے کراچی کے چڑیا گھر کو دے دیں گے۔" اس نے کہا۔ مگر میں نے اس کا دل نہ دکھانے کے لئے یہ بات نہیں پوچھی کہ اسے بڑے شوق سے کھایا بھی تو جاتا ہے۔

ابھی ہم تھوڑے ہی آگے بڑھے تھے کہ ایک کالا ناگ نالی کے کنارے کے ساتھ باہر بیٹھا غالباً دھوپ سینک رہا تھا۔ کیونکہ موسم سرما کی خنکی ابھی باقی تھی۔ سانپ جومو کو

اچانک اپنے سر پر آتا دیکھ کر گھاس میں دبک گیا اور جومو کی نظر اس پر نہیں پڑی اور وہ آگے بڑھ گیا۔ ناگ نے موقع پا کر نزدیک کے ایک بل کی طرف جست لگائی۔ لالو جومو سے چند قدم پیچھے تھا سانپ کو دوڑتا دیکھ کر ایک دم لپکا۔ میں چونکہ لالو سے چند قدم پیچھے تھا کیا دیکھتا ہوں کہ سانپ ابھی آدھا بل میں گھسا تھا کہ لالو نے کمال پھرتی سے اس کو جا لیا اور اپنے دونوں ہاتھ سے اس کی دم کو پکڑ کر اسے باہر گھسیٹ لیا۔ اور سب کچھ اس قدر تیزی اور مہارت کے ساتھ پیش آیا کہ میری آنکھوں کو یقین نہیں آیا اور ایک سیاہ اور جوان کالا ناگ بڑی بے بسی کے عالم میں لالو کے ہاتھ سے بے ضرر طریقہ پر لٹک رہا تھا اور اسے بھی جیتو کی جھولی میں محفوظ کر لیا گیا۔ اس طرح تقریباً ایک گھنٹہ کے اندر ہم دو کالے سانپ اور ایک گوہ کا شکار کر کے واپس جوگی بستی کی طرف چل دیئے۔

جب ہم بستی پہنچے تو دوپہر ہو چکی تھی اور کھیمو کی جوگن بیوی ہمارے لئے کھانا پکا رہی تھی۔ کھیمو کے بوڑھے سسر نے مجھے دکھانے کے لئے سانپوں کے زہریلے دانت نکالنے کی رسم ادا کی۔ اس نے چولہے کے ساتھ پڑی ہوئی مسالہ پیسنے کی سل کو الٹا کر کے رکھا اور جوگن سے سبزی کترنے والا چاقو مانگا۔ ناگ کی گردن بوڑھے جوگی کے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور انگلیوں کے درمیان اس طرح دبی ہوئی تھی کہ تھوڑا زور دینے پر سانپ کا منہ پوری طرح کھل گیا۔ اس نے سانپ کے کھلے منہ کو سل پر رکھا اور اپنے دائیں ہاتھ میں چاقو لے کر اس کے نچلے جبڑے کے چار دانت جو دو دائیں طرف تھے اور دو بائیں طرف نکال باہر کئے۔ سانپ کے منہ سے خون بہہ نکلا۔ اس کے بعد یہی حرکت جوگی نے سپنی کے ساتھ کی اور اب سانپوں کا وہ جوڑا بے ضرر تھا۔

سانپوں کے اس شکار میں ایک خاص بات جو میں نے دیکھی وہ یہ تھی کہ سانپ ڈسنے سے پہلے پیٹھ اور دم کے سہارے جست مارنے کی پوزیشن بناتا ہے جس میں اس کا مکمل طور پر آزاد ہونا ضروری ہے اور دوسرے یہ کہ قوت کے ساتھ ڈنگ مار کر سانپ ہلکی سے جست کے ذریعہ جبڑوں کو پلٹ کر اپنے شکار میں زہر انڈیلتا ہے۔ لہٰذا اگر سانپ کو اچانک پیٹھ یا دم سے پکڑ کر زمین سے اوپر اٹھا لیا جائے تو وہ زہریلا ڈنگ مارنے کے قابل نہیں رہتا۔ میں نے دیکھا کہ کھیمو۔ لالو یا بوڑھے جوگی نے جب بھی ناگ پر ہاتھ ڈالا تو وہ نہایت چابک دستی کے ساتھ دم اور پیٹھ کے درمیان کے حصہ پر تھا اور اس طرح وہ ناگ کو ڈسنے کا موقع نہیں دیتے تھے۔

"بھائی کھیمو امید ہے کہ جوگی بستی میں یہ میری آخری دعوت نہیں ہو گی۔"

"بھائی زہر تو زہر کو کاٹتا ہے انسان کو نہیں۔ اور تم تو پھر بھلے انسان ہو بے فکر ہو کر جی بھر کے کھاؤ۔"

ظاہر ہے شکار کی تھکاوٹ کی وجہ سے بھوک لگی تھی اور میں نے پیٹ بھر کے جوگیوں کا کھانا کھایا۔

اوکھا جوگی

حیدر آباد شہر میں دیال داس کلب اور سیشن کورٹ کے بیچ ایک پتلی سی گلی میں کوئی پچیس گھروں کی چھوٹی سی جوگی بستی ہے۔ جوگیوں کی یہ بستی یا کچی آبادی اتنی ہی پرانی ہے جتنی پاکستان کی تاریخ۔ یہ جوگی جو وقت کے دھارے کے ساتھ بہتے ہوئے ایک جگہ اکٹھے ہو گئے ہیں ان میں چند گھر مارواڑی بولنے والوں کے ہیں چند گجراتی۔ چند سندھی اور چند خالص اردو بولنے والے جوگیوں کے ہیں۔ مگر جس چیز نے ان کو انسانی پیار اور بھائی چارے کی ایک حسین لڑی میں پرو دیا ہے وہ ہے ان کا موڑھے اور چک بنانے کا مشترک دھندا اور سر پر ہر وقت منڈلاتی ہوئی بھوک و افلاس اور عدم تحفظ کا احساس۔ یہ لوگ مل جل کر دن بھر چک اور مونڈھے بناتے ہیں اور پھر قریب کی سڑک اور فٹ پاتھ پر بیٹھ کر انہیں بیچتے ہیں۔ سندھ میں چونکہ سال کے آٹھ مہینے شدید دھوپ کڑکتی ہے اور گرمی پڑتی ہے اس لئے دروازوں کھڑکیوں اور ورانڈوں پر چک لگا کر گھروں کو ٹھنڈا رکھنا ایک قدیم مگر ضروری ریت ہے۔ چونکہ شہر میں ان خانہ بدوشوں کے علاوہ اس فن سے دوسرے لوگ زیادہ واقف نہیں اس لئے ان کا دھندا خوب چلتا ہے اور یہ لوگ آسانی کے ساتھ اپنی گزر بسر کر لیتے ہیں۔

کڑکتی دھوپ میں سڑک کے کنارے بچوں اور عورتوں سمیت دن بھر یہ خانہ بدوش کام میں جتے قابل دید نظارا پیش کرتے ہیں۔ ان کی عورتیں بالخصوص اندلس کی جپسی عورتوں کے ساتھ حیران کن حد تک مشابہت رکھتی ہیں۔ وہی سانولے اور سڈول جسم۔ گھنے سیاہ بال اور مچلتی سیاہ آنکھیں۔ بدن پر ہلکی انگیہ اور لمبے غرارا نما گھگھرے یا ساڑھیاں۔ اپنے تیکھے نقوش اور لاابالی سی چال ڈھال میں بے شک وہ غرناطہ اور سویلے کے خانہ بدوش نظر آتے ہیں۔

مذہب کے معاملہ میں بھی وہ روایتی رواداری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ گو ان کی اکثریت ہندو ہے مگر ان میں چند گھر مسلمانوں کے بھی ہیں اور چند قبل از وید ناستکوں کے بھی۔ مگر مذہب کے معاملے میں وہ ایک دوسرے کی دل شکنی نہیں کرتے اور نہ ہی وہ کسی قسم کا

تعصب برتتے ہیں۔ گویا کہ وہ بڑے مہذب، پرامن اور سیکولر لوگ ہیں۔

کانجی اوکھا اپنے لحیم شحیم اور بھاری بھرکم قد و قامت کے ساتھ ان خانہ بدوشوں کا روایتی سردار نظر آتا تھا۔ وہ ہر وقت اپنی بیوی بچوں کے ساتھ چک بنانے میں مصروف نظر آتا۔ جب میں پہلی بار اس سے ملا تو مجھے محسوس ہوا کہ اس کی ظاہری دیوہیکل شخصیت کے پیچھے ایک انتہائی نرم مزاج، بھلا بااخلاق اور سادھو منش انسان چھپا تھا۔ اس کی انسان دوستی کی میٹھی باتوں میں گہرا درد بھرا تھا۔

"اچھا تو تم بھی مارواڑی ہو؟" اس نے اپنائیت سے پوچھا۔

"ہاں! خالص مارواڑی اور کسی حد تک خانہ بدوش بھی۔" میں نے بھی اسی مانوسیت سے جواب دیا۔

"تو پھر تو خوب رہے گی۔ ہم تو بس پریم کے بھوکے ہیں۔ اور انسان نے شاید پریم کرنا قدیم زمانہ ہی میں چھوڑ دیا تھا۔" وہ چپ سادھ کر چک میں آری سے تیز تیز ٹانکے لگانے لگا۔

کھانے کا وقت ہو چلا تھا۔ اوکھا مجھے بھی اپنے ساتھ گلی میں اپنی چھوٹی سی کٹیا میں لے گیا۔ مجھے احساس تھا کہ جوگی عموماً اتنا جلد اجنبیوں کو اندر کے دائرے میں نہیں لیجاتے۔ مگر اوکھا نے اپنے بال دھوپ میں سفید نہیں کئے تھے۔ وہ دھرتی کی نچلی پرت سے اٹھا ہوا انسان تھا اور اسے برے اور بھلے کی خوب تمیز تھی۔

جب اوکھا کی بیٹیوں، ایشوری اور لیلا نے ہمارے لئے کھانا لگایا تو اس کے لڑکے شنکر، ارجن اور تلسی بھی ساتھ آ بیٹھے۔ جوگیوں کے اس سادہ مگر پرخلوص کھانے میں کتنا سواد تھا۔

اوکھا کے گھر میں گجراتی بولی جاتی تھی۔ اس کے باپ دادا چھپن کے مشہور قحط کے زمانے میں مغربی ہندوستان سے خانہ بدوشی کرتے ہوئے سندھ آ نکلے تھے۔ اس کا آبائی گاؤں کاٹھیاواڑ میں احمد آباد شہر کے نزدیک تھا۔ اور کاٹھیاواڑ میں یہ لوگ سلاوٹ کے نام سے مشہور تھے۔ اور پتھر تراش کر چکی۔ سل اور لوڑے بناتے تھے۔ ان کے سانولے پکے رنگ۔ مادری نسل کا سماج اور فن کے ساتھ رغبت اور خانہ بدوشوں کی سی چال ڈھال سے صاف پتہ چلتا تھا کہ یہ لوگ داروڑ نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ مگر اوکھا دراوڑ نسل کے دیگر بھٹکے ہوئے لوگوں کی طرح اپنے آپ کو آریہ نسل کا ہی سمجھتا تھا۔ گو ان کی قبائلی گنگھ میں چند ایک شاخیں راجگر، چوہان، پرمار، مانگریے، لاکوبے، راٹھوڑ اور راوڑے نام سے بھی

تھیں۔ ''پھر تم جوگی کیسے بن گئے؟'' میں نے اوکھا سے پوچھا۔

''ہم جوگی بنے نہیں بلکہ بنا دیئے گئے۔'' اس نے کہا۔ ''یہ تو معلوم نہیں کب مگر کہتے ہیں کہ قدیم زمانے میں پرس رام نام کا ایک آریہ راجہ ہندوستان پر حکومت کرتا تھا۔ یہ راجہ بہت ہی ظالم تھا اور پرجا پر بہت ظلم ڈھاتا تھا اور لوگ اس سے تنگ آ کر بغاوت کرنے کی فکر میں تھے۔ ایک جوتشی براہمن نے اسے ایک دن بتلایا کہ جنگجو' چھتریوں میں (غالباً داروڑ قبائل) ایک بچہ پیدا ہو گا جو کرشن بھگوان کا روپ دھارے گا (سیاہ رنگ کا ہو گا) اور وہ پرس رام کے راج پاٹ کو ختم کر دے گا۔

راجہ نے حکم دیا کہ آج کے بعد چھتریوں (راجپوتوں) میں جو بھی بچہ پیدا ہو اس کو مار دیا جائے اور راجہ کی فوج نے اتنے نوزائیدہ بچے مارے کے لوگ باگ گھر بار چھوڑ کر جنگلوں میں بھاگ گئے اور خانہ بدوشوں کی سی زندگی گزارنے لگے تاکہ اپنے بال بچوں کو بچا سکیں۔ مگر وہ لوگ جو بھاگ نہ سکے انہوں نے آریا جوگی بن کر جان بچائی۔ اس طرح ہم جوگی بن گئے۔

گو کہ ہندوستان کے بیشتر لوگوں کا تعلق ایک ہی ذات یا نسل سے ہے مگر ظالم حکمران طبقوں نے اپنی کرسی مضبوط رکھنے کے لئے انسانوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بانٹ دیا ہے تاکہ ان کا راج پاٹ سلامت رہے۔ اوکھا سنجیدگی کے ساتھ یہ کہہ کر چپ ہو گیا مجھے پرس رام کے نام سے ایک مشہور ضرب المثل یاد آئی جو میں نے بچپن میں سنی تھی۔

''مایا تیرے تین نام ۔ پرسیا' پرسو' پرس رام۔''

یعنی آدمی غریب ہو تو لوگ اسے پرسیا کہتے ہیں اور جب تھوڑا سوکھا ہو جائے تو پرسو ۔اور جب وہی آدمی بہت امیر بن جائے تو وہی لوگ اس کو پرس رام کہنا شروع کر دیتے ہیں۔

''بالکل ٹھیک ہے۔'' اوکھا نے کہا ''اسی اصول کے تحت کل کے راجے آج کے جوگی ٹھہرے۔کون جانے کل ہم کیا تھے۔''

تو پھر ہمارے معاشرے میں ذات پات کا سوال حقیقت میں طبقاتی سوال ہے۔ میں نے نتیجہ نکالا۔

اوکھا بالکل ان پڑھ تھا۔ مگر اس کا بڑا بیٹا شنکر اس کو اردو کی کتابیں پڑھ کر سناتا۔ بھگت کبیر داس کے دوہے اسے بہت پسند تھے۔

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ بھگت کبیر داس نے مسلمان جولاہے کے گھر میں جنم لیا تھا؟" میں نے اوکھا سے پوچھا۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ بھگوان تو ہر مذہب میں جنم لیتے ہیں۔ مذہب خواہ کوئی بھی ہو انسان میں انسانیت کا ہونا ضروری ہے۔ انسانیت جو پریم اور وسیع بھائی چارے کا پرچار کرتی ہے۔ ایک برا آدمی اچھا ہندو یا مسلمان نہیں بن سکتا اور اسی طرح ایک اچھے انسان کی کسی بھی مذہب میں کوئی قید نہیں۔ کبیر داس بہت عظیم انسان تھے۔ وہ انسان سے پریم کرتے تھے۔ اسی لئے آج ہر انسان ان سے پریم کرتا ہے۔ پھر اوکھا نے ہلکے ہلکے گا کر کبیر داس کے کچھ دوہے سنائے۔

جے پتھر پوجے ہری ملے _ تو میں بھی پوجوں پہاڑ
اس پتھر سے چکی بھلی _ جو پیس کھائے سنسار

مالا میری کاٹھ کی _ دھاگے لئے پروئے
من میں گھنڈی پاپ کی _ رام جپے کیا ہوئے

چلتی چکی دیکھ کر _ دیا کبیرا روئے
دو پاٹن کے بیچ میں _ ثابت بچا نہ کوئے

یہ تھا اوکھا جوگی اور اس کے خانہ بدوش لوگ۔ مگر اس حالت میں بھی پرس رام کا بنایا ہوا آریہ سماج ان کو معاف کرنے کو تیار نہیں تھا۔ لالچی لوگ اس زمین کے ٹکڑے پر نظر جمائے بیٹھے تھے جس پر ان کی چھوٹی چھوٹی کٹیائیں تھیں۔ دوسری طرف عیسائی مشنری رات دن بستی کا طواف کرتے تھے تاکہ انہیں عیسائی بنا لیں۔ اونچی ذات کے ہندو پنچایتیں انہیں اچھوت اور شودر ہی دیکھنا پسند کرتی ہیں جب کہ ضیاء الحق کے اسلامی دور میں شکر ہے بیچارے مولوی کو کھانے پینے سے ہی فرصت نہیں ورنہ ان کا ناطقہ ہی بند کر دیں۔ مگر اوکھا کا لفظی معنی ہے مشکل اور پیچیدہ لہٰذا وہ اتنی آسانی سے ہار ماننے کو تیار نہیں۔

ہلال احمق

کیا آپ نے کبھی محسوس کیا ہے کہ کبھی کبھی محض حادثاتی طور پر انسان کی زبان سے نکلے ہوئے چند کلمات یا قلم سے لکھے ہوئے چند الفاظ کس خوفناک حد تک سچے ثابت ہو سکتے ہیں۔ پچھلے ماہ میں نے "اسٹار" کے پندرہواڑے کالم میں حیدر آباد کے چک بنانے والے جوگیوں کی ایک کچی بستی کے بارے میں لکھا تھا کہ کچھ لالچی لوگ اس بستی کو مسمار کر کے اس جگہ پر قبضہ جمانے کی فکر میں ہیں۔ اور اب جب میں یہ سطور لکھ رہا ہوں اس وقت تک حیدر آباد میونسپل کارپوریشن نے بلا کسی نوٹس یا معاوضے کے بلڈوزروں کی مدد سے چڑھائی کر کے چشم زدن میں پچیس گھروں کی اس چالیس سالہ بستی کو گرا کر ملیا میٹ کر دیا ہے۔

انسانی بے حرمتی کی اس وحشیانہ کاروائی کے لئے جو جواز ڈھونڈا گیا وہ یہ تھا کہ اس قسمت ساز دن کو اس جگہ پر حیدر آباد ضلع کی ہلال احمر ایمبولینس سینٹر کی نئی بلڈنگ کا سنگ بنیاد رکھا جانے والا تھا۔ اور اس سے بھی بڑی مضحکہ خیز بات یہ تھی کہ اسی شام سندھ حکومت کے ایک عالی جناب وزیر صحت و رفاح عامہ اس تقریب کی بذات خود رونمائی کرنے والے تھے۔ یہ ضیاء مارشل لاء کے دور کا نقطہ عروج کا وقت تھا۔ اور مثل مشہور ہے کہ جب سیاں بنے کوتوال تو ڈر کاہے کا۔ نہ کوئی داد فریاد اور نہ کوئی پوچھنہار!

زہے قسمت میں بھی شیطان کی آنت کی طرح اتفاق سے اسی وقت یہاں آنکلا۔ دور سے میں نے جوگیوں کی اس بستی پر دھول کے بادل اڑتے دیکھے تو مجھے یوں لگا جیسے ابھی ابھی اس علاقہ پر دشمن کے طیاروں نے بمباری کی ہو۔ قریب پہنچا تو دیکھا کہ کالے کالے خانہ بدوش بچے اور عورتیں خوف کے مارے سہمے ہوئے ایک دوسرے میں دبکے ہوئے کھڑے ہیں۔ دوسری طرف بوڑھے اور جوان خانہ بدوش اپنے گرتے ہوئے مکانات اور اس کے گرد و غبار سے اپنا بچا کھچا سامان نکالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اُن کے چہروں پر بے بسی کی ایک عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ نہ کوئی احتجاج دیکھنے میں آیا اور نہ ہی کوئی چیخ و پکار جو کہ ایسے موقع پر شہر کے لوگوں کا خاصہ ہوتا ہے۔ مگر بیشک ان کے چہروں پر خوف

و ہراس کی ایسی لکیریں تھیں جن کو صدیوں کے بہیمانہ ظلم و استبداد نے بہت گہرا کر دیا تھا۔ ہمیشہ کی طرح ایک دفعہ پھر پکی چھتوں نے ان کے سر پر گرنے سے پہلے انہیں باہر کے کھلے میدان میں اگل دیا تھا۔ دھرتی کے ان قدیم ترین باشندوں کے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ نام نہاد مہذب سماج نے ہمیشہ ہی ان کو کتوں کی طرح دھتکار کر اور جرائم پیشہ یا نیچ قرار دے کر شہروں سے دور بھگا دیا تھا۔ خانہ بدوشوں کی ہر نسل نے کسی نہ کسی مقام پر اپنے اجڑنے کا نظارہ ضرور دیکھا تھا۔ اور اس طرح آریاؤں کے ہاتھوں اپنی اولین ہزیمت کے بعد اپنی ہی مقبوضہ زمین پر گاؤں۔ صوبے' اور دیش بدیش رلنا ان کی فطرت نہیں بلکہ ضرورت بنا دی گئی تھی۔

جب کانجی اوکھا کا کٹیا نما گھر اس کی آنکھوں کے سامنے دھڑام سے گرا تو اس کی دلجمعی کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں تھے۔ یا پھر میری زبان بھی گنگ ہو گئی تھی۔ اوکھا کی ایک پوری نسل اس مکان میں پیدا ہوئی تھی اور پھلی پھولی تھی۔ اور اب پل بھر میں وہ سب کچھ تباہ ہو گیا تھا جو انہوں نے اپنے خون اور پسینے سے چند دہائیوں میں بنایا تھا۔ بے بس اور بے ضرر لوگوں کے خلاف سماج کا یہ کتنا کھلا۔ شرمناک اور سنگدلانہ مظاہرہ تھا۔

اوکھا دیوار کے سہارے پیٹھ لگا کر فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام رکھا تھا۔ اس کے گھنے بال دھول میں لت پت تھے اور اس کی سرخ آنکھوں میں وحشت ٹپک رہی تھی۔ اس نے ہلکے سے منہ اٹھا کر آسمان کی طرف گھورا۔ نیلا اور اودا خالی خالی سا آسمان اس کا منہ چڑاتا نظر آیا۔

"سچائی کہیں نہیں ہے۔ یہ دنیا غلاظت کا ایک ڈھیر ہے۔" وہ دھیمے سے اندر ہی اندر بڑبڑایا۔ "ہاں! سچائی کہیں نہیں ہے۔ یہ دنیا ایک طویل دوزخ ہے جس کا کوئی انت ہی نہیں۔" یہ کہہ کر اس نے آنکھیں موند لیں جیسے سو گیا ہو ____ پچھلے چوبیس گھنٹوں سے اس نے کچھ نہیں کھایا تھا اور ایک دفتر سے دوسرے دفتر تک بھاگنے اور اعلیٰ عہدہ داروں کی منت سماجت کرنے میں بتا دئے تھے۔ وہ ایک فوجی جرنل کے پاس بھی گیا مگر اس سب کچھ کے باوجود وہ اپنے لوگوں کو تباہ ہونے سے نہیں بچا سکا۔

"کیوں؟ کیوں؟ ایک بوڑھے خانہ بدوش نے اونچی آواز میں میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "وہ ہمیں نوٹس دے سکتے تھے۔ ہمارے لئے متبادل جگہ کا بندوبست کر سکتے تھے۔ کیا ہم اس ملک کے شہری نہیں ہیں؟ وہ ہمارے آقا اور مائی باپ تو ہیں ہی۔ ہم نچلے درجے کے کمین ہندو بھلا ان کا کیا مقابلہ کر سکتے تھے۔" اس نے گہرا سانس لیا "مگر نہیں انہوں نے ہم

پر سوتے میں بلڈوزر چڑھا دیے۔ ان کی بلا سے یہ چھتیں ہمارے سوتے ہوئے بچوں کے سروں پر گر سکتی تھیں۔ ان لوگوں کو خدا کا خوف نہیں۔ بالکل نہیں!" وہ تھوڑی دیر چپ سادھ کر بولا۔

"ایک بڑا صاحب (غالباً ڈی۔ سی۔ حیدر آباد) اپنے عملے کے ساتھ اس وقت یہاں آیا جب سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ معاوضہ اور متبادل جگہ کا وعدہ بھی کیا۔" پھر اس نے بے یقینی کے ساتھ اس طرح میری طرف دیکھا جیسے معلوم کرنا چاہتا ہو کہ کیا یہ سچ ہے یا یہ بھی بندر ڈنڈے اور گڑ کی بھیلی کا پرانا کھیل۔

جب میں نے اوکھا کی دلجمعی کے لئے اس کے بھاری کندھوں پر ہلکے سے تھپکی دی تو اس نے میری طرف یوں دیکھا جیسے نیند سے جاگ گیا ہو۔

"ارے صاحب" وہ مسکرایا۔

"چلو گھر چلتے ہیں۔ بھوک لگی ہے۔" اس نے خانہ بدوشوں کی روایتی لاابالی پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے فٹ پاتھ سے اٹھ کر کہا۔ ہم دونوں چل کر اینٹوں کے اس ڈھیر پر جا بیٹھے جہاں کچھ گھنٹے پہلے اس کا گھر تھا۔ اس کے بال بچے بھی ماتم کی سی حالت میں پیر پسارے، وہیں پڑے تھے اور ہمیں دیکھ کر جھینپتے ہوئے اٹھ بیٹھے۔ میں بھی انسانی پراگندگی کے اس ڈھیر پر بیٹھ گیا اور میرا دل بھی ان لوگوں کی طرح پسیج گیا۔ اس کی بیوی کچھ کھانا لے کے آئی جس کو اوکھا نے دو دن سے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ اور ہم نے مل کر کھانا کھایا۔ خانہ بدوشوں کی یہ دعوت اس دعوت سے کتنی مختلف تھی جو چند دن قبل ہم نے اسی گھر میں کھائی تھی۔

اسی شام جب جوگی بستی کے کھنڈرات رات کے اندوہناک اندھیرے میں ڈوب گئے تو سامنے محض چند قدم کے فاصلہ پر سیشن کورٹ کے احاطے میں بڑی بے حیائی کے ساتھ ہلال احمر کا جشن بپا تھا۔ بڑے بڑے قمقموں اور روشنیوں سے منور سٹیج پر مہمان خصوصی لاؤڈ سپیکر کی آواز پر چیخ چیخ کر اپنے وہ کارنامے بیان کر رہا تھا جو اس نے وزیر صحت کی حیثیت سے رفاح عامہ کے لئے انجام دئے تھے۔ مجھے یہ تمام سین امیتابھ بچن کی مزاحیہ فلم کا حصہ نظر آیا۔ میں نے اوکھا کا دل ہلکا کرنے کے لئے مذاق میں کہا۔

"ہم سلاوٹ اور چوہان جوگی تو ہیں ہی۔ ایسے میں اگر پتھر کے دور میں واپس لوٹ گئے تو یہ کونسی نئی بات ہے۔ اور پھر میں نے کبیرداس کا ایک دوہا سنایا۔

"کبیرا تیری جھونپڑی گل کیٹوں کے پاس
جو کرے گا سو بھرے گا تو کیوں بھیو اداس۔"

اوکھا کے چہرے پر بڑی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ایک ایسی مسکراہٹ جو خانہ بدوش کا خاصہ ہوتی ہے اور پھر ہلکی سی درد بھری آواز میں جواب کے طور پر کبیر داس کا یہ دوہا گنگنایا۔

"تال سوکھ کر پتھر بھیو
ہنس کہیں نہ جائے
پچھلی پریت کے کارنے
پتھر چگ چگ کھائے۔"

وقت کے مسافر

"جب مغلوں نے چتوڑ گڑھ کا قلعہ فتح کیا تو ہم نے قسم کھائی تھی کہ جب تک مغلوں سے قلعہ خالی نہ کروا لیں گے چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ گھر بار اور عیش و آرام کی زندگی کو تیاگ دیں گے۔ چارپائی پر بستر نہیں بنائیں گے۔ دھات کے برتنوں میں کھانا نہیں کھائیں گے اور سونا چاندی ہم پر حرام ہو گا۔ اس طرح صدیوں ہم لوہار لوگ بیل گاڑیوں میں اپنے گھر سجائے گاؤں گاؤں اور قریہ قریہ پھرتے رہے ہیں مگر اپنی قسم کو کبھی نہ توڑا۔"
پریم آنند جو میرے گاؤں کے گاڈیے لوہاروں کا مہاراج تھا اس نے مجھے بتلایا۔ ان لوہار خانہ بدوشوں کو ہندوستان میں گاڈیے لوہار اور سندھ میں کاریے کہتے ہیں۔ پریم آنند کے مطابق گاڈیے لوہاروں کا تعلق راجستھان کی مغربی ریاست میواڑ کے جنگجو راجپوت قبائل سے تھا۔ اور ان کی موٹی موٹی نکھوں کو سولانگی۔ پرمار۔ چوہان' بازونا اور بھاگیلا کہا جاتا تھا اور یہ سب لوگ ماتا کی پوجا کرتے ہیں۔"

راجستھان' گجرات' مہاراشٹر اور مدھیا پردیش سے لے کر سندھ تک خانہ بدوشی کرنے والے ان لوہار قبائل میں یہ کہانی عقیدے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور وہ اسے اکثر اپنی روایتی خانہ بدوشی کے جواز کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ان لوہار مردوں کی مونچھیں لمبی اور ڈاڑھیاں بیچ سے مانگ کی ہوتی ہیں۔ ان کی عورتوں کے بازو کندھے تک سفید یا رنگین پلاسٹک کی موٹی موٹی چوڑیوں سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ اکثر اوقات یہ عورتیں سڑکوں کے کنارے اپنے کام میں مگن بھاری ہتھوڑا چلاتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ جہاں یہ لوہار درانتی۔ کلہاڑی' کدالیں' ہل کی پھال و دیگر زرعی آلات بناتے یا مرمت کرنے میں مصروف ہوتے ہیں۔

گاڈیہ لوہار اپنے مخصوص پیشہ کے علاوہ مذہبی۔ لسانی اور تہذیبی اعتبار سے انہی علاقوں کے دیگر خانہ بدوش قبائل سے زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ قیاس ہے کہ یہ بھی دراوڑ نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد گاڈیے لوہار کچی آبادیوں میں بسنے لگے۔

"کیوں؟ کیا اب ان کی چتوڑ کے قلعہ کو فتح کرنے کی قسم پوری ہو گئی۔" میں نے پریم

آنند سے پوچھا۔ پریم آنند میرا سوال سن کر ہلکے سے مسکرایا اور اس کی بوڑھی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہوئی۔

"ہاں اب وہ قسم پوری ہو چکی ہے۔" اس نے کہا "یہ غالباً پچاس کی دہائی کے شروعات کا ذکر ہے۔ ہندوستان کے وزیراعظم جواہر لال نہرو نے جس کو قدیم تاریخ کا خاصا علم تھا۔ گاڈیے لوہاروں کا ایک بڑا سمیلن منعقد کیا۔ اور صدیوں پرانی آزادی کی جنگوں میں گاڈیے لوہاروں کی قربانیوں اور تاریخی کردار کا اعتراف کرتے ہوئے تعریف کی اور پھر درخواست کی کہ چونکہ مغل فوجیں کب سے چتوڑا کا قلعہ خالی کر چکی ہیں لہٰذا اب گاڈیہ لوہاروں کی خانہ بدوشی کا مزید کوئی جواز نہیں ہے اور اب یہ کہ حکومت انہیں مستقل رہائش کے لئے پلاٹ بھی دے گی اور گھر بنانے کے لئے آسان قسطوں پر قرضہ بھی مہیا کرے گی۔"

مگر گاڈیے لوہاروں نے پنڈت نہرو کو جواب دیا کہ جب تک گاڈیے لوہار چتوڑ کے اپنے آبائی قلعہ میں فاتح کی حیثیت سے داخل نہیں ہوں گے تب تک مستقل رہائش کی پیش کش قبول کرنے پر تیار نہیں ہیں۔ اس پر ایک رسمی جنگ کا ناٹک رچایا گیا۔ ہزاروں گاڈیے لوہار تلواروں اور ڈھالوں سے لیس ہو کر چتوڑ کے قلع پر حملہ آور ہوئے اور فاتح کی حیثیت میں اندر داخل ہوئے۔ تب لوہاروں کی قسم پوری ہوئی اور اب وہ چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں جہاں کہیں تھے بسنے لگے۔

"کیا اب لوہار نئی آباد زندگی سے خوش ہیں؟" میں نے ان سے پوچھا "پرانی عادات آسانی سے نہیں مرتیں!" بھگو نے کہا جو حال ہی میں چتوڑ گڑھ کی یاترا کر آیا تھا۔

"عمومی طور پر زندگی کی ڈگر پہلے کی طرح ہی ہے۔ مگر فرق یہ پڑا ہے کہ اب ہم جبلی حرکت کرنے اور چلتے رہنے کے نشہ کے تابع نہیں ہیں پہلے ہم یوں بھاگتے رہتے تھے جیسے ہمارے پیچھے مغلوں کی فوجیں لگی ہوں۔ مگر اب وہ مجبوری جیسے ختم ہو گئی ہو۔ پھر بھی ہم خانہ بدوشی کی زندگی سے زیادہ دور نہیں نکل پائے ہیں۔ گو کہ ہماری اکثریت نے اب جھگیاں اور کچے مکانات بنا لئے ہیں اور بعض لوہاروں کے پکے مکان بھی ہیں۔ تو بھی وہ رات کو مکان چھوڑ کر کھلے آسمان تلے سونا پسند کرتے ہیں۔"

اس عرصہ میں ہمارے کمرے میں کیول۔ کرشن، نارائن اور پریم بڑی تعظیم کے ساتھ داخل ہوئے اور ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گئے۔ سانولے اور چمکدار آنکھوں والے یہ لوہار لڑکے اسکول سے آئے تھے اور ان میں سے ایک آدھ کالج کا طالب علم بھی تھا۔ پریم

انجینئر بننا چاہتا تھا۔ ان کی اکثریت میواڑ کی تاریخ میں دلچسپی رکھتی تھی۔ میں نے انہیں ٹاڈ راجستھان نامی مشہور کتاب سے میواڑ کی تاریخ کا اقتباس لا دینے کا وعدہ کیا۔ اور جب میں نے ان سے اجازت چاہی تو وہ چارپائیوں پر براجمان تھے۔ کانسی اور پیتل کے برتنوں میں کھا پی رہے تھے اور ان کے کانوں میں چھوٹی چھوٹی سنہری مرکیاں لٹک رہی تھیں۔

بھیل بھگت

بھیل غالباً برصغیر ہند و پاک کے قدیم ترین لوگوں میں سے ہیں- چند رونس- رات کے راہی اور جنگلوں کے باسی ان بھیلوں کا رنگ روپ بھی ان کے قدیم دیوتاؤں شیو شمبھو- کرشن بھگوان اور کالی ماتا سے ملتا جلتا ہے جن کی پوجا وہ بڑی عقیدت کے ساتھ کرتے ہیں-

موہن جودڑو کے کھنڈرات سے ہزاروں سال پرانے جو چالیس انسانی ڈھانچے ملے ہیں وہ کولھی- بھیل اور دیگر خانہ بدوشوں سے ملتے جلتے ہیں- بھیل عورتیں آج بھی اسی طرز کے کپڑے- زیورات اور برتن بھانڈے استعمال کرتی ہیں- جو قدیم وادی سندھ کے لوگوں میں عام تھے- بیشک بھیل قدیم دراوڑی تہذیب کے وارث قبائل میں سے ایک ہے- یوں تو بھیلوں کا ذکر بھگوت گیتا میں بھی ملتا ہے مگر قدیم اور جدید تاریخ نشان دہی کرتی ہے کہ آریاؤں کی فتوحات سے قبل بھیل راجستھان اور گجرات پر حکومت کرتے تھے- ایس- بی- راجیہ گور کی کتاب تاریخ گجرات میں رقم ہے کہ-

"انڈو سیتھن مشرقی ترکستان سے اٹھ کر پہلے پہل ایران میں سیستان یا شاکستان میں آباد ہوئے اور پھر سندھ پر حملہ آور ہو کر وہاں آن بسے- جین تاریخ کے مطابق کالا آچاریا نے شاکا حاکموں کو اجین پر چڑھائی کرنے کی دعوت دی کیونکہ گجرات کے راجہ گاردا بھیل نے کالا آچاریہ کی حسین بہن سرسوتی کو بقول اس کے زبردستی اغوا کر لیا تھا-"

چاہے گجرات کے راجہ گاردا بھیل نے زوری سے اسے اٹھایا تھا یا پھر رام چندر جی کے سری لنکا پر چڑھائی کرنے کے لئے راون پر سیتا کو اٹھا لے جانے کے الزام کی طرح یہ بھی اجین پر چڑھائی کرنے کا ایک بہانہ تھا اس بحث سے در گزر اس حقیقت کا پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ میں دراوڑ راون کی طرح گجرات اور راجستھان پر بھی دراوڑ راجہ گاردا بھیل کی حکمرانی تھی-

بھیل لوگ کتھاؤں اور روایتوں کے مطابق قدیم زمانہ میں راجستھان اور گجرات پر ان کی حکومت تھی- اور قیاس ہے کہ بعد میں ان کی ہی ایک دوغلی نسل نے جو اب ٹھاکر

کہلواتی ہے بیرونی حملہ آوروں کا ساتھ دے کر بھیلوں سے راج پاٹ ہتھیا لیا۔ مالوہ۔ راجپوتانہ اور گجرات کے بیشتر راجواڑے خاندان زمانہ حال تک اس حقیقت کا اعتراف کرتے رہے ہیں۔ مثال کے طور پر ان خاندانوں میں ریت تھی کہ نئے راجہ کی رسم تاجپوشی کے دوران قدیم خاندانی بھیل کے انگوٹھے کے خون سے راج تلک لگا کر نئے راجہ کو جائز قرار دینا ضروری رسم سمجھی جاتی تھی۔ اس طرح نیا راجہ قدیم حکمران خاندان کا جائز وارث قرار پاتا۔

غرضیکہ پدرم سلطان بود یا نہیں۔ آج کل بیشتر بھیل قبائل راجستھان اور گجرات کی پہاڑیوں اور دریائے نربدا کے شمال کے جنگلات میں بکھرے ملتے ہیں۔ خیال ہے کہ جیسا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے بعد کے نو آباد کاروں نے ان کو بے دخل کر کے پہاڑوں اور جنگلوں میں دھکیل دیا۔ اور جو بھیل میدانی علاقوں میں موجود رہے انہیں یا تو غلام بنا لیا گیا اور یا پھر وہ ہیر اور مینوں کی صورت میں چوریاں یا ڈاکہ زنی کرتے رہے۔ بھیل اب بھی زیادہ تر راجستھانی' طرز کا لب و لہجہ رکھتے ہیں۔ جنگلوں اور پہاڑوں کے بھیل زیادہ تر سانولے اور پستہ قد ہیں۔ جبکہ میدانی علاقوں کے بھیل قد آور اور ہلکے رنگ کے ہیں ـــــــ

جنگل اور پہاڑوں کے بھیل زمانہ حال تک تیر کمان کا استعمال کرتے تھے اور راج پیپلہ نامی بھیل ریاست کی آزادی کا بڑی بے جگری سے دفاع کرتے تھے اور قدیم رسم و رواج کے مطابق اپنی زندگیاں گزارتے تھے۔ دیگر قدیم قبائل کی طرح وہ اپنے جسموں کو کپڑے لتوں سے کم اور ہار۔ مالا اور زیورات سے ڈھانپنا زیادہ پسند کرتے تھے۔ جنگل کی غیر مادی اور سادہ زندگی نے انہیں آزاد منش۔ خوش اخلاق اور توہم پرست بنا دیا تھا اور وہ میدانی علاقوں کے لوگوں کی طرح غلامانہ طرز کی محنت مشقت کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اسی لئے آباد کار لوگ انہیں بیکار سمجھ کر جنگلی اور وحشی قرار دیتے رہے ہیں۔

بھیلوں کے ناچ راجستھانی گھومر اور گجراتی گربا سے ملتے جلتے ہیں۔ وہ زیادہ تر عورتوں کا لباس پہن کر یا جنگلی جانوروں کے روپ میں ناچتے ہیں۔ مگر اب آہستہ آہستہ قدیم رسم و رواج کو چھوڑتے جا رہے ہیں۔ بالعموم بھیلوں کا عقیدہ ارواح پرستی یا مظاہر پرستی پر مبنی ہوتا ہے۔ جو قدیم ہندو تہذیب کی قبل از وید زمانہ کی شکل ہے۔ مگر اب بھی نہ تو وہ اجتماعی مندر بناتے ہیں اور نہ ہی برہمن طرز کے آریہ ورت پر ایمان رکھتے ہیں۔ انفرادی طور پر وہ اپنے گھر کے ایک کونے میں پرستش کے لئے چھوٹی سی جگہ بناتے ہیں جہاں اپنے اوتاروں کو دان پن کی نیاز دیتے ہیں۔ پرانی مثال ہے کہ "کولھی کسی کا میت نہیں اور بھیل کسی کا

بھگت نہیں" غالباً یہ مثال برہمنوں سے منسوب ہو گی۔
مگر آج کل بھیلوں میں بھگتی کا رواج عام ملتا ہے۔ بیشتر بھیل خاندان پورن ماشی کے چاند کو ثواب کی خاطر "ست سنگ" کی محفل شب گرم کرتے ہیں جس میں تنبورہ۔ ڈھول اور کھڑتال کی مدد سے رات بھر بھگت کبیر۔ میرا بائی اور برہمانند وغیرہ کے دوہے گاتے ہیں۔ ان دوہوں میں بھائی چارے اور پریم پرچار کا پیغام ہوتا ہے۔ بھیلوں کی توہم پرستی میں دیو۔ ڈائن اور بھوت پریت کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اسی لئے بھگت اور بھوپے کا رواج اب بھی عام ہے۔ ہولی اور دیوالی کے تہواروں پر وہ ننگے پیر آگ پر چلتے ہیں اور ہندوستان میں اس رسم کا تعلق قدیم اور دراوڑی قبائل سے ہی ہے۔
صحرا تھرپارکر کا علاقہ ایک طویل عرصہ تک راجستھان کے راجاؤں اور سندھ کے مسلمان حکمرانوں کے درمیان رزم گاہ بنا رہا ہے لوک روایت کے مطابق پابوجی راٹھور نے بھیل فوج کی مدد سے تھر کے اس ریگستانی علاقے پر اپنی حکمرانی قائم کی تھی اور اس فتح میں ڈیمبو اور سونڈو نام کے دو بھیل سورما سپہ سالاروں نے مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ تب سے صحرا تھر میں بڑی تعداد میں بھیل آباد ہیں جن کی اپنی زمینیں بھی ہیں ____
جب سے انگریزوں نے سندھ میں سکھر بیراج تعمیر کیا اور نئے علاقے سیراب کر کے آباد کئے تب سے تھری بھیلوں کی ایک بڑی تعداد سندھ میں آ کر آباد ہونی شروع ہو گئی۔ اور آج کل لوئر سندھ میں کولھی اور میگھواڑوں کے ساتھ ساتھ بھیل بھی بے زمین کسانوں کے طور پر کاشتکاری کرتے ہیں۔ اور یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ موجودہ لوئر سندھ میں جیسا کہ میں نے پہلے کہا تقریباً ستر فی صد زراعت کا بوجھ انہی لوگوں کے کندھوں پر ہے۔ ایوب خان کی زرعی اصلاحات کے دور میں کچھ کولھی بھیل اور میگھواڑوں کو زمین الاٹ ہوئی تھیں۔ لہٰذا اب سازگار حالات میں یہ لوگ نیم خانہ بدوشی کی زندگی کو خیرباد کہہ کر آباد ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مگر بدقسمتی سے پاکستان حکومت کی طرف سے کبھی بھی شعوری طور پر انتظامیہ نے انہیں آباد کرنے کی کوشش نہیں کی ____
کچھ روز قبل دیوالی کے موقع پر میں کچھ بھیل دوستوں کی دعوت پر ان کے ہاں گیا۔ گھاس پھوس سے بنی پوری بستی میں جشن کا سا سماں تھا۔ گو دیپ زیادہ دیکھنے میں نہیں آئے شاید تیز ہوا میں ان جھونپڑیوں کو آگ لگ جانے کا خدشہ تھا۔ عورتوں اور بچوں نے بہت بھڑکیلے کپڑے پہن رکھے تھے اور لڑکیاں تو گویا زیورات میں لدی ہوئی تھیں۔ رات کو ست سنگ کی محفل گرم ہوئی۔ نارو بھگت' سینو بھیل' موتی اور کرشن نے تنبورہ' جھانجھ

کھڑتال اور گھڑا بجا کر سماں بندھا، سانولے اور حسین بھیل جس کے کانوں میں سرخ رنگ کے نگ جڑے تھے وجد اور دھن میں سر نکالا۔

"شری رام کہے سکھ کاری ۔ سن سوری بات ہماری
تیرے پریم میں ڈوبے آئے ۔ تیرے جھوٹے بیر بھی کھائے
مم بھگت کی پیاری سن سوری بات ہماری
ذات، ورن میں نہ جانوں ۔ نیچ بھگت کو اونچ کر مانوں
میرے بھگت ہوئے سکھ کاری ۔ سن سوری بات ہماری۔
"

"یہ سوری کون تھی؟" میں نے نارو بھگت سے پوچھا۔

"سوری بھیل بھگتن تھی جو جنگل میں رہتی تھی اور رام چندر کی سیوک تھی۔ رامائن کے مطابق ایک دفعہ جب رام چندر کا یہاں سے گذر ہوا تو سوری نے عقیدت کے طور پر جنگل سے کچھ بیر توڑ کر دیئے۔ مگر پیش کرنے سے پہلے سوری نے پہلے بیر خود چکھے کہ کہیں کھٹے تو نہیں اور رام چندر جی نے بڑے پیار سے وہ بیر کھا لئے۔" نارو بھگت نے بتلایا۔

"اس طرح رامائن کی یہ کہانی موجودہ ذات پات۔ اونچ نیچ اور چھوت چھات کے آریہ سماج کی نفی کرتی ہے جو حقیقت میں برہمنوں نے مہاراج بننے کے لئے خود تشکیل کیا۔"

نارائن داس بھگت جسے پیار میں سب نارو بھگت کہتے تھے۔ پورن بھگت، شیو پران، شیو کلیان اور رامائن کا بھرپور عالم تھا۔ اس نے مجھے بتلایا کہ بھیل اور راجپوت ایک ہی نسل کی پیدائش ہیں اور یہ کہ بہت بعد میں سازش کے طور پر آریہ سماج کے سفید برہمنوں نے کالے چھتریوں کے ایک حصہ کو اپنے ساتھ ملا کر پرجا کو غلام بنا لیا۔

نارائن بھگت کے مطابق لوک کتھاؤں میں راجہ حماجلی بھیل کا ذکر آتا ہے جو کیلاش پربت کا حاکم تھا۔ راجہ گیہا بھیل جو مدھیہ پردیش کے جنگلوں پر حکمرانی کرتا تھا اور جس نے رام چندر کو بن باس کے زمانہ میں پناہ دی تھی۔ بعد کی تاریخ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ جب مغل فوج مہارانا پرتاپ کے خون کی پیاسی تھیں تو مہارانا نے پہاڑی بھیلوں میں پناہ لی اور اس طرح بھیل سینا نے مغل فوج کی پیش قدمی روک دی۔

"تو پھر بھیل اتنے اونچے مقام سے اتنی نیچی سماجی سطح پر کیسے آگرے۔" میں نے پھر سوال کیا۔

اس پر نارو بھگت نے رامائن سے ایک لمبی داستان سنائی جو میں نے سی۔ نرود چودھری کی کتاب' Continent of Circe میں بھی پڑھی تھی۔ اس داستان کے بموجب رام چندر کے بھائی ارجن اور لچھمن دروچنا نام کے ایک برہمن گرو سے تیراندازی کی شکشا لیتے تھے۔ اسی جماعت میں ایک بھیل لڑکا لووا بھیل اتنا ہونہار شاگرد تھا کہ کوئی بھی ہم جماعت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس پر ارجن اور لچھمن نے گرو سے شکایت کر کے لووا کی شکشا بندی کروا دی۔ لووا بھیل جنگل کے اپنے گاؤں کو واپس چلا گیا۔ اس نے خود سر درد چناگرو کی ایک مورتی بنائی اور روزانہ گرو کی اس مورتی سے شکشا پانے کی اجازت لے کر تیر اندازی کی مشق کرتا رہا ۔۔۔۔ کافی عرصہ گزر جانے کے بعد ایک بار ارجن اور لچھمن شکار کرتے ہوئے اس جنگل میں آ نکلے لووا کیا دیکھتا ہے کہ ایک شکاری کتا ایک ہرن کا پیچھا کر کے اس کو پکڑنے ہی والا ہے لووا نے تیر کمان نکال کر ایک تیر شکاری کتے کی زبان سے آر پار کر دیا کتا تیر کھا کر درد سے چلاتا اپنے آقاؤں کی طرف واپس لوٹا تو لووا نے بھاگتے کتے کے تیر سے دوسرا تیر نکال دیا۔ جب ارجن اور لچھمن نے تیراندازی کا یہ ماجرا دیکھا تو تیر انداز لووا بھیل کے پاس آئے اور اس سے پوچھا کہ تم نے یہ علم کس گرو کی شکشا میں حاصل کیا؟ لووا نے بتلایا کہ اس کا گرو دروچنا برہمن ہے۔ اس پر وہ لووا کو دروچنا کے پاس لے گئے اور کہا کہ مہاراج آپ نے تو لووا کو نیچ کہہ کر شکشا بندی کر دی تھی تو کیا چوری چوری اسے شکشا دیتے رہے؟

دروچنا بڑا حیران ہوا اور اس نے لووا سے پورا ماجرا پوچھا۔ لووا نے اس کو بتلایا کہ گرو کی شکشا بند ہو جانے پر کس طرح اس نے جنگل میں گرو کی مورتی بنائی اور اس سے شکشا لیتا رہا اور یوں گیان حاصل کیا۔ اس پر دروچنا برہمن نے اس سے پوچھا کہ کیا اس نے اس عرصہ گرو کو شکشا کا بلیدان دیا؟ لووا نے کہا نہیں۔ اس پر دروچنا نے اسے حکم دیا کہ وہ گرو شکشا کا بلیدان دے جو اس پر لازم ہے۔ لووا نے کہا "مہاراج مانگو میں بلیدان دینے کو تیار ہوں۔" اس پر دروچنا نے کہا کہ اپنے دائیں ہاتھ کا انگوٹھا کاٹ کر گرو کو پیش کرو اور لووا بھیل نے اپنا انگوٹھا کاٹ کر دروچنا برہمن کو دے دیا۔ مگر اس کے بعد وہ ہمیشہ کے لئے تیر اندازی کے فن سے محروم ہو گیا۔ رامائن کی اس چھوٹی سی کہانی کا لب لباب یہ ہے کہ کس طرح چھتریوں نے آریہ برہمن سے ساز باز کر کے دراوڑ پرجا کی اصل طاقت چھین لی اور اسے غلام بنا لیا۔

نارو بھگت کبھی سکول نہیں گیا۔ مگر اس نے بھی لووا بھیل کی ریت پر چلتے ہوئے

ہندی، سندھی اور اردو زبان میں پڑھنا سیکھ لیا تھا۔ اس نے فلسفیوں کی سی سنجیدگی کے ساتھ مجھے ذات پات کے نسلی تعصب اور چھتریوں (ٹھاکروں) اور آریہ سماج کے برہمنوں کی ملی بھگت کے خلاف کھری کھری باتیں سنائیں۔ اس نے کہا کہ وہ آج بھی ذات پات اور چھوت چھات کا اسی طرح شکار ہیں جس طرح پہلے تھے۔ یہاں تک کہ غریب ہندو اور غریب مسلمان بھی انہیں معاف کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ اس نے یہ بھی بتلایا کہ برہمنوں کی لکھی ہوئی بیشتر مذہبی اور تاریخی کتابیں جھوٹ کا پلندا ہیں جن میں اپنا الو سیدھا کرنے کے لئے اصل تاریخی حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے۔ اس نے یہ بھی بتلایا کہ والمیکی رامائن جو حقیقت سے کچھ قریب ہے وہ والو نام کے ایک بھیل بھگت نے لکھی تھی جو بھگت بننے سے پہلے ایک مشہور ڈاکو اور باغی تھا۔

نرم مزاج اور نرم گفتار نارو بھگت ایک خوش کن شخصیت کا حامل تھا۔ گو اس کے دکھ بہت گہرے تھے مگر اس کی زبان کسی قسم کی ترشی یا جذبات سے عاری تھا۔ بلکہ اس کے بولنے کے انداز میں ایک پرامید مقصدیت کا غلبہ تھا۔ اس کا شائستہ اور مہذب اخلاق اس بات کا پتہ دیتا تھا کہ کبھی نہ کبھی یہ لوگ کسی ترقی یافتہ تہذیب کے امین تھے۔

جب میں نے اجازت چاہی تو رات آدھی ہو چکی تھی۔ اور قرب و جوار کا دیہات گہرے اندھیرے میں ڈوب چکا تھا۔ دن کے تھکے ماندے کسان سو چکے تھے اور ایک پراسرار خاموشی نے دیہات کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اندھوناک اندھیرے میں جب ہماری بیل گاڑی چوں چوں کی آواز نکالتی نہر کے کنارے پہنچی تو بالو بھیل نے بلند آواز میں ایک سر نکالا۔

"موہے لگن لگی رہے پر بھوپاون کی
پاون کی گھر لاون کی
موہے لگن لگی رہے پر بھوپاون کی۔"

دراوڑ تہذیب کے گم شدہ لوگ

1986ء میں میرپور خاص کی ایک ادبی سنگت نے مجھے "خانہ بدوش اور سماج میں ان کا مقام" کے موضوع پر بولنے کے لئے مدعو کیا۔ اس موضوع پر جو کچھ میں نے کہا وہ مختصراً یوں تھا۔

خانہ بدوش ہمارے معاشرے کے انتہائی محروم اور اداس لوگ ہیں۔ یہاں تک کہ وہ نام نہاد نچلی ذاتوں کی سطح سے بھی کم تر سمجھے جاتے ہیں۔ ہمارے طبقاتی، نسلی اور ذات پات سے پلید معاشرے میں وہ معمولی سی توجہ کے مستحق بھی نہیں ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خانہ بدوش کون ہیں؟ اور یہ کہ ہماری تاریخ ان کی بابت کلی طور پر خاموش کیوں ہے؟ یا یہ کیسے ممکن ہوا کہ ہمارے نام نہاد مہذب معاشرے کا ضمیر صدیوں سے بھٹکتے ہوئے ان انسانوں کے بارے میں آج تک نہیں جاگا؟ میں اس سے پہلے بھی یہ کہہ چکا ہوں کہ کیا لوگوں کو کتوں کی طرح بھٹکنے، بھوکا مرنے، بے بسی اور افلاس بھری زندگی گزارنے اور گھربار تیاگ دینے کا بھی شوق ہو سکتا ہے؟۔

یہاں ایک اور سوال بھی ابھرتا ہے کہ انسان کے مہذب یا وحشی قرار پانے کی تعریف کیا ہے۔ ہم میں سے کتنے لوگوں نے خانہ بدوشوں کو قتل، زنا، ڈاکہ زنی یا دوسرے سنگین معاشرتی جرائم کا مرتکب پایا ہے؟ جب کہ ہمارے شہروں کے بستے رستے محلوں میں اس طرح کے جرم رات اور دن ہوتے ہیں۔ اس طرح کے درجنوں سوال ہمارے ذہنوں میں ابھرتے ہیں جن کے پس منظر میں ہم ان کے تاریخی و سماجی حالات کا جائزہ لینا چاہیں گے۔

انسانیت کروڑوں سال کی طویل مسافرت پر محیط ہے ابتدائی صورت میں برفانی دور میں داخل ہوئی۔ اس کے بعد پتھروں کے ادوار سے گزرتی ہوئی شکاری اور پھر چرواہ گری کے مرحلہ تک پہنچی یہ سب انسان کا وحشت کا دور کہلاتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں انسان کے دریائی وادیوں میں آباد ہو کر کھیتی باڑی کرنے بستیاں بنانے یا مہذب بن جانے کی تاریخ محض دس ہزار سال پرانی ہے جسے تاریخ میں کانسے کا دور بھی کہا جاتا ہے اور جدید ترقی یافتہ تہذیب کی ابتدا حقیقت میں کانسے کے دور ہی سے شروع ہوتی ہے۔ یعنی انسان کی وحشت

و بربریت کی تاریخ کے سامنے تہذیبی تاریخ ایک نقطے کی حیثیت رکھتی ہے۔

کانسے کے دور کی یہ تہذیبیں بھی انگلیوں پر گنی جا سکتی ہیں۔ یعنی افریقہ کی مصری تہذیب، مشرقی وسطیٰ کی سومیری تہذیب اور جنوب ایشیاء کی دریائے سندھ کی تہذیب تقریباً ہم عصر تھیں۔

گو کہ دریائے سندھ کی تہذیب خاصی ترقی یافتہ تھی مگر اس کی دریافت اتنی جدید ہے کہ عام لوگوں کو اس کے بارے میں ابھی تک زیادہ کچھ معلوم نہیں لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ اس تہذیب اور اس کے لوگوں کے بارے میں کچھ تفصیلی جائزہ لیا جائے۔

ویدائیں، پران، اپنشید ہندوستان کی قدیم مقدس کتابیں مانی جاتی ہیں۔ مگر ان کو کس نے اور کب تخلیق کیا اس کے بارے میں تاریخ مبہم ہے اور زیادہ کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ مگر ان کتابوں کے بارے میں برہمنوں کی سنسکرت میں لکھی ہوئی تحریروں اور تفسیروں سے جو آریا قوم کی تعریف میں لکھی گئی ہیں اور جو آریہ لوگوں کو اشرافیہ طبقہ اور بھگوانوں کی پسندیدہ نسل بنا کر پیش کرتے ہیں صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ کتابیں برہمنوں کی تخلیق ہیں اور ان تحریروں میں کہیں کہیں تو برہمن خود بھگوانوں کا روپ دھار لیتے ہیں۔

انہی مقدس کتابوں میں ہمیں غیر آریہ کے نام سے عام لوگوں کا بھی ذکر ملتا ہے جو رنگ روپ کے کالے ہیں اور آریہ لوگوں سے لڑائی جھگڑوں میں الجھے رہتے ہیں۔ ان لوگوں کو شودر، راکھشش اور ملیچھ بھی کہا گیا ہے اور ان لوگوں کو ناپاک یا اچھوت کہہ کر سماج کے سب سے نچلے درجہ پر رکھا گیا ہے۔

مگر ان قدیم کتابوں سے یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں کہ زمانہ قدیم ہی میں ہندوستان کے لوگوں کو آریا نام کے بیرونی حملہ آوروں نے غلام بنا لیا تھا جن کی زبان سنسکرت تھی اور جنہوں نے ذات پات کا ایسا سماجی ڈھانچہ رائج کر لیا تھا جیسا کہ آج کل ہمیں جنوبی افریقہ میں گوری نسل پرستی کے طور پر اپار تھائیڈ کے نام سے ملتا ہے۔ مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ اتنا طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود ذات پات کا یہ قدیم نسلی ڈھانچہ جس کی بنیاد محض حاکم و محکوم طبقات کے رنگ و نسل پر رکھی گئی تھی آج تک جوں کا توں قائم ہے۔ صرف بدھ ازم نے ایک مختصر عرصہ کے لئے اسے چیلنج کیا اور کسی حد تک کمزور بھی کیا مگر توڑنے میں ناکام رہا اور برہمن ازم بودھ مت کو بھی ہضم کر گیا۔ مگر بدھ مت نے ان نچلی ہوئی ذاتوں کو چھٹکارے کا ایک راستہ ضرور دکھلایا۔ اسی لئے صدیوں سے نچلی ذاتوں کے ہندو، جین، بودھ، مسلمان، سکھ اور عیسائی بن کر جان چھڑانے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔

مگر ان دراوڑ قبائل کی اکثریت قبل از ویدک عقیدے پر ہی قائم رہی اور برہمنی سماج سے دور دور ہی رہی۔ بلکہ بہت سے قبائل ناستک عقیدوں سے ہی منسلک رہے۔ مگر اونچی ذات کا آریہ سماج بھی انہیں آسانی سے معاف کرنے کو تیار نہ تھا اور ان کے چھوٹے کرم کو دھرم کا نام دے کر خوفناک طریقہ پر ان کا اقتصادی استحصال کرتا رہا۔

آریاؤں کی بڑائی کی دیومالائی داستانوں کی قلعی اس وقت کھلی جب 1928ء میں دریائے سندھ اور راوی کے کنارے پانچ ہزار سال پرانے دو شہر اور شمالی ہندوستان کی دیگر دریاؤں کے ساتھ ساتھ بے شمار کھنڈرات دریافت ہوئے۔ ان کھنڈرات میں سندھ میں موہن جودڑو' پنجاب میں ہڑپہ' راجستھان میں کالی بنگن اور گجرات میں لوتھل خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

موہن جودڑو دریائے سندھ کے کنارے پانچ میل پر محیط تجارتی شہر تھا جہاں سے مصر اور عراق کو تجارت کی جاتی تھی۔ ایک لاکھ آبادی کا پورا شہر پکی اینٹوں کا بنا ہوا تھا۔ شہر کے درمیان پکی سڑکیں گلیاں اور شاہرائیں تھیں۔ پانی کے نکاس کے لئے زمین دوز نالیاں بنی تھی۔ تین منزلہ پکے مکانات کے ساتھ نجی غسل خانے' کنوئیں اور پاخانے بنے تھے جن کا انتظام آج کے سندھ کے شہروں کے مقابلہ میں خاصا جدید تھا۔ شہر کے بیچ میں اناج کا ایک بڑا گودام قومی بنک کی نشاندہی کرتا ہے اور تعلیم کے ایک بڑے مرکز کے نشانات بھی ملے ہیں۔ مگر مصر اور عراق کی طرح نہ تو یہاں بڑے قلعے اور نہ ہی بادشاہوں کے محلات ملے ہیں۔ قیاس ہے کہ یہاں کا نظم و نسق پنچایتی انتظامیہ چلاتی تھی۔ شہر میں ایک بہت بڑا تالاب بھی ہے جسے اس فنکارانہ مہارت سے بنا گیا ہے کہ لگتا ہے یہ مقدس جگہ تھی۔ لوگ مختلف پیشوں میں بٹے ہوئے ضرور تھے۔ مثلاً تجار طبقہ تجارت کرتا تھا اور کسان اور مزدور محنت مشقت کرتے تھے مگر ان کے ذات پات میں بٹنے یا اونچ نیچ ہونے کے کوئی نشانات نہیں ملتے۔ اس شہر سے جو برتن بھانڈے اور زیورات دستیاب ہوئے ہیں وہ آج کل کے خانہ بدوش قبائل کے زیورات اور دیگر اشیاء سے ملتے جلتے ہیں۔ مگر موہن جودڑو اور ہڑپہ میں آریاؤں کا کوئی نام و نشان نہیں ملا ہے۔ مشہور ہے کہ آریہ ہندوستان میں لوہا لے کر آئے مگر قدیم شہروں میں لوہے کا انام و نشان بھی نہیں ملا ہے۔ یہ شہر مکمل طور پر کانسے کے دور سے تعلق رکھتے ہیں ___ موہن جودڑو میں جو چالیس انسانی ڈھانچے ملے ہیں وہ بھی دراوڑ قبائل سے ملتے جلتے ہیں اور آریاؤں سے ان کا نسلی تعلق ظاہر نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر ان کے قد چھوٹے' سر گول ناک چپٹی اور رنگت سانولی تھی۔ اس

قدیم دریافت نے برہمنوں کی مقدس کتابوں کا پردہ چاک کر دیا۔

قبل از وید دور کی دراوڑی تہذیب کی دریافت کے بعد ہمیں اپنی قدیم تاریخ پر پھر سے نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے۔ گوادر اور گومل سے لے کر گجرات اور راجستھان تک پھیلی ہوئی یہ شاندار تہذیب مکمل طور پر دراوڑی تہذیب تھی۔ کوئی ہزار قبل مسیح کے عشرے میں یہ تہذیب طبقاتی تضادات کی وجہ سے ریخت پا ہونی شروع ہوئی جس کا سہارا لے کر غالباً آریہ قبائل نے ہندوستان کو اپنے حملوں کا نشانہ بنایا۔ مگر موہن جودڑو کا شہر ان حملوں سے بہت پہلے دریائی سیلابوں کے ذریعہ غرقاب ہو چکا تھا۔

وادی سندھ کے دراوڑ لوگ خوش حال' مہذب اور پرامن تھے۔ جب کہ شمال مغرب سے حملہ آور ان کے مقابلہ میں بھوکے' وحشی اور چرواہے تھے۔ چونکہ وہ لوہے کے بہتر ہتھیاروں سے مسلح تھے فتح مند ہوئے انہوں نے دراوڑوں سے ان کی زمین چھین کر جنوب اور مشرق کی طرف دھکیل دیا۔ اس کے بعد آریاؤں نے جو سماجی ڈھانچہ تشکیل دیا وہ آج تک قائم ہے۔ یعنی برہمن آریہ نسل کی اونچی پرت سے تعلق جتاتا ہے تو دراوڑ آج کے اچھوت' شودر اور آدی واسی ٹھیرے۔

میری نظر میں بیشتر خانہ بدوش قبائل دراوڑ تہذیب کے گم شدہ لوگ ہیں جو اب صدیوں کی بھٹکن کے بعد اپنی تاریخ بھول گئے ہیں۔ ایک زمانہ میں یہ خانہ بدوش ہندوستان کی سرحدوں سے باہر نکل کر دنیا بھر میں پھیل گئے جنہیں جپسی کہا جاتا ہے۔ اگلے صفحات میں ہم جپسیوں کا ذکر کریں گے۔

جپسی-1

ہر سال 24 مئی کو یورپ کے جپسی یا خانہ بدوش ساون کے بادلوں کی طرح یورپ کے کونوں کھدروں سے نکل کر گھرتے ہوئے جنوبی فرانس کے رہون دریا کے ڈیلٹائی علاقہ میں ایک چھوٹے ساحلی شہر سینٹ این میری پر اُمڈ پڑتے ہیں۔ یورپ بھر میں یہ دن جپسیوں کے تہوار کے طور پر مشہور ہے۔ بڑے بڑے قافلوں کی صورت میں جپسیوں کے خاندان کے خاندان اپنے گھوڑوں اور گٹاروں سمیت ہزاروں کی تعداد میں یہاں جمع ہوتے ہیں اور پھر اپنے مخصوص فلیمنکو ناچ اور گیتوں بھرا ایک طوفان برپا کر دیتے ہیں جہاں وہ اپنی اوتار کالی میڈونا ساآرا یا کالی ماتا کی مورتی نکالتے ہیں۔ جنوبی فرانس میں جپسیوں کے اس مقدس میلے کی تاریخ کم سے کم پانچ سو سال پرانی ہے۔

لفظ جپسی اب اپنی روایتی اور رومانوی سحر انگیز معنویت کھوتا جا رہا ہے۔ یہ لفظ اب ہمارے حواس پر وہ جادو نہیں چھوڑتا جو چند سال قبل گیبریل گارسیہ مارکویز کی کتاب "صد سالہ محصوری" کے ابتدائی صفحات پڑھنے سے محسوس ہوتا تھا۔ لفظ جپسی کی اصل معنویت اب بھٹکتے ہوئے انسانوں کی ہزار سالہ درد بھری محصوری کے بعد اور گہری اور حقیقی ہو گئی ہے۔

یونیسکو کی حالیہ تحقیق کے مطابق یورپ اور اب دنیا بھر میں بکھرے ہوئے جپسی کوئی ہزار سال قبل ہندوستان سے آئے تھے۔ اور یہ کہ وہ ہندوستان کے موجودہ خانہ بدوشوں ہی کا ایک حصہ ہیں۔ ہندوستان کے یہ خانہ بدوش آج بھی برصغیر ہند و پاک کے کونے کونے میں بھٹکتے دیکھے جا سکتے ہیں۔ کب اور کن مخصوص حالات میں انہوں نے ہندوستان کی دھرتی کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہا اور کیوں؟ اس کے بارے میں جپسولوجسٹ کوئی ایک سو سالہ تحقیق کے باوجود کوئی ٹھوس رائے قائم نہیں کر سکے ہیں۔

مگر یہ حقیقت صاف ہے کہ اپنی اس ہزار سالہ پراسرار خانہ بدوشی اور ہجرت کے دوران وہ جہاں کہیں بھی گئے ہندوستان سے بھی بدتر نسلی تعصب کا شکار ہوئے اور یورپ کی بیشتر اقوام نے ان پر ظلم کے پہاڑ توڑے۔ پولیس نے صدیوں ان کے مردوں کا قانونی

طور پر شکار کیا۔ ان کی جوتشی عورتوں کو کالی جادوگرنیاں (Witches) کہہ کر زندہ جلا دیا گیا اور دوسری جنگ عظیم کے دوران نازیوں نے کوئی تیس لاکھ جپسیوں کا قتل عام کیا۔ جب کہ پچاس لاکھ یہودیوں کے مارے جانے پر انسانی عالمی ضمیر کو جھنجھوڑا بھی گیا اور اس ضمن میں معاوضہ دے کر اس کی تلافی کرنے کی کوشش بھی کی گئی۔ مگر جپسیوں پر ظلم و ستم کو عالمی برادری نے یوں بھلا دیا جیسے وہ انسان ہی نہیں تھے۔ غرضیکہ جپسیوں یا خانہ بدوشوں کے بارے میں انسانی ضمیر ایک مردہ حقیقت سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ ہندوستان کے کونے کونے سے لے کر دنیا کے دور دراز علاقوں تک پھیلے ہوئے جپسی قبائل کی تاریخ نسلی، مذہبی، سماجی اور اقتصادی تعصب اور امتیازی سلوک کی ایک بدترین مثال ہے جو بنی نوع انسان کے چہرہ پر ایک بدنما داغ کی طرح کلنک بن کر صدیوں چمٹی رہے گی۔ کوئی انسان اجتماعی طور پر از راہ شوق دوزخ کا راستہ قبول نہیں کرتا۔ بلکہ لوگ ہمیشہ بے بسی کے عالم میں ایک دوسرے انسان کے ہاتھوں ذلت بھری زندگی بتانے پر مجبور کر دیے جاتے ہیں اور لوگوں کی اصل تاریخ بھی اسی انسانی عمل سے عبارت ہے۔

ہند و پاک کے موجودہ خانہ بدوشوں کی حالت کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ آریہ ویدک ہندوستان کا ذات پات پر مبنی ظالمانہ اور سنگ دلانہ معاشرہ ہی ان کو اپنی دھرتی سے مار بھگانے کا اصل محرک رہا ہے۔

فیلیکس گرانڈ کہتا ہے کہ "یہ کہنا تو بہت مشکل ہے کہ ہندوستانی خانہ بدوشوں نے یہ درد ناک سفر کب شروع کیا۔ مگر یہ کہنا مشکل نہیں کہ پانچ ہزار سال پہلے یہ خانہ بدوش انتہائی ترقی یافتہ تہذیب کے امین تھے۔ خانہ بدوشوں کے ہندوستان کی سرحد عبور کرنے کی خواہ کوئی بھی وجہ ہو مگر اس ہزار سالہ جہاں گردی کے دوران یورپ کے کسی ملک نے بھی انہیں قبول نہیں کیا۔ اچھوتوں اور دھتکارے ہوئے لوگوں کی طرح نہ صرف وہ علیحدہ رکھے گئے بلکہ کسی نہ کسی حیلے بہانے انہیں غلام منڈیوں میں بیچ دینا، جیلوں میں محبوس رکھنا یا پھر انہیں ملک بدر کر دینا عام رسم تھی۔ نو آباد کاری کے دور میں تقریباً تمام کالونیل طاقتوں نے انہیں جرائم پیشہ قرار دے کر اپنی کالونیوں میں جلاوطن کر دیا۔ اس طرح یہودیوں یا افریقہ کے غلاموں کی طرح آہستہ آہستہ انہیں پوری دنیا میں بکھیر دیا گیا۔ غرضیکہ نسل پرست آریاؤں کے ہاتھوں دنیا بھر میں جپسیوں کو وہی ذلت اٹھانی پڑی جس سے فرار ہو کر وہ ہندوستان سے نکلے تھے۔

ہندوستانی خانہ بدوشوں کے بارے میں سب سے پہلا نوشتہ ہمیں ایران کے حمزہ

اصفہانی کے قلم سے دسویں صدی عیسوی میں ملتا ہے۔ بقول اس کے کوئی بارہ ہزار فنکار ہندوستان سے آئے جو اس کے مطابق ناچنے والوں' گانے والوں' قسمت کا حال بتلانے والوں اور گھوڑوں اور قالینوں کے سوداگروں پر مشتمل تھے اور کبھی کبھی چوری چکاری بھی کرتے تھے۔ اس کے کوئی پچاس سال بعد تقریباً یہی بیان فردوسی نے شاہ نامہ میں دہرایا۔

خیال ہے کہ ایران سے خانہ بدوشوں کا یہ قافلہ یا چھوٹے چھوٹے قافلے دو سمتوں میں بٹ گئے۔ایک گروپ مشرقی یورپ کی طرف بڑھنا شروع ہوا جو سربیہ' بلغاریہ' رومانیہ' پولینڈ' ہنگری اور روس سے ہوتا ہوا سائبیریا تک جا پہنچا۔

جب کہ دوسرا گروپ مغربی اور جنوبی یورپ کی طرف بڑھا جو جرمنی' برطانیہ سے ہوتا ہوا سیکنڈے نیویا پہنچا اور اس کی دوسری شاخ فرانس' پرتگال' اٹلی' اسپین اور یونان پہنچی' اس سفر کے دوران کچھ یورپی الفاظ ان کی ہندوستانی زبان میں داخل ہوئے اور کچھ ثقافتی اثر وہ یورپی ملکوں پر چھوڑتے گئے۔

یورپ کی چودہویں صدی کے عیسائی زائرین اور یاتریوں اور سیاحوں نے ان خانہ بدوشوں کے بارے میں کافی مواد چھوڑا ہے۔ فرائر سیمون نے لکھا کہ اس نے ان خانہ بدوشوں کو کریٹ' میں دیکھا جہاں وہ کالے خیموں میں رہتے تھے اور ان کو حام کی نسل سمجھا جاتا تھا۔

یونان میں ان کی خاصی بڑی بستی تھی۔ رنگ روپ کے اعتبار سے کالے یا سانولے تھے اور چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں میں رہتے تھے۔ وہ اعلیٰ درجہ کے لوہار قلعی گر یا پیتل کا کام کرنے والے۔ ٹوکریاں بنانے والے جوتشی اور دیگر فنکارانہ صلاحیتوں کے حامل تھے۔ ان کی دستکاریوں سے متاثر ہو کر یونانیوں نے ان کی بستی کو "چھوٹا ایجپٹ" کا لقب دے دیا۔ جس کی وجہ سے آہستہ آہستہ لوگ انہیں ایجپشین (یعنی مصری) کہنے لگے۔ اور پھر یہی لفظ تبدیل ہو کر مخفف کے طور پر جپسی بن گیا۔ گو کہ ان خانہ بدوشوں کا ایجپٹ یا مصر سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔

قیاس ہے کہ ایران سے نکلنے کے بعد یہ خانہ بدوش ایک طویل عرصہ تک ترکی اور یونان کے قریب قیام پذیر رہے۔ اسی لئے ان کی زبان پر ترکی اور یونانی زبانوں کا بہت اثر ہے۔ مگر بعد میں ترکوں اور بازنطینی رومیوں میں جنگ چھڑ جانے کی وجہ سے وہ یورپ کے اندرونی علاقوں کی طرف بڑھ گئے۔

1418ء میں ان کے بڑے بڑے جتھے ہنگری اور جرمنی کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھے

گئے۔ اس وقت ان کے پاس بادشاہ سگمنڈ کا راہ داری کے طور پر پروانہ تھا۔ وہ بحر بالٹک کے ساحل کے ساتھ ہوتے ہوئے فرنیک فرٹ سے گزرتے ہوئے دیکھے گئے۔

1419ء میں وہ فرانس میں دیکھے گئے اور اس کی سرحد عبور نہ کی کیونکہ اس کے پار دوسرے بادشاہ کی حکمرانی تھی اور اس کا پروانہ راہ داری ان کے پاس نہیں تھا۔ اس زمانہ تک ان کے قبائلی سرزار یورپی طرز پر ڈیوک اور کاؤنٹ کہلوانے لگے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اب وہ یورپ کی جنگوں میں حصہ لینے لگے اور جنگ جیتنے کی صورت میں بادشاہ ان کے سرداروں کو ان القابات سے نوازنے لگے اور عزت و احترام بھی دینے لگے۔

اگست 1427ء کے دوران جپسی فرانس میں ظاہر ہوئے جب کہ یہ علاقہ انگریزوں کے قبضہ میں تھا۔ پیرس کے لوگوں کے لئے ان کی بستی دستکاری کی خرید و فروخت اور دلچسپ تفریح گاہ کے طور پر مقبول ہوئی جہاں لوگ ان کی چیزیں بھی خریدتے اور ان کے ناچ گانوں سے بھی محظوظ ہوتے۔ پھر جلد ہی پیرس میں ان خانہ بدوشوں کے بارے میں عجیب و غریب افواہیں پھیل گئیں۔ ایک افواہ کے مطابق جپسی جادوگر لوگ تھے اور جب لوگ انہیں قسمت کا حال بتلانے کے لئے ہاتھ دکھلاتے تو پراسرار طور پر ان کی جیبوں سے بٹوے غائب ہو جاتے وغیرہ وغیرہ۔ گو کہ پیرس کے بشپ نے ان افواہوں کو غلط قرار دیا مگر نتیجہ کے طور پر ان خانہ بدوشوں کو پیرس چھوڑنا پڑا۔

جولائی 1492ء میں ڈیوک آندرے کی قیادت میں خانہ بدوشوں کا ایک بڑا جتھا اٹلی کے شہر فورلی اور بلونا سے گزرا۔ پوچھنے پر جپسیوں نے بتلایا کہ وہ پوپ سے ملنے جا رہے ہیں۔ اصل میں جپسیوں کو جلد ہی احساس ہو گیا کہ اس زمانہ کے کٹر عیسائی پادری عیسائی زائرین کو سفر گزر کے سلسلہ میں خاصی مراعات دیتے تھے۔ اس لئے جپسیوں نے جلد ہی عیسائیت کا لبادہ پہن لیا تاکہ عیسائی زائرین کی حیثیت میں یورپی سرحد میں عبور کرنے کا جواز مل سکے اور اس طرح وہ پوپ کا پروانہ راہ داری حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اٹلی میں وہ پوپ سے راہ داری حاصل کر کے فرانس کے بیچوں بیچ ہوتے ہوء عیسائی زائرین کے طور پر اسپین پہنچے۔ جہاں کا سٹیلون کے کانسٹیبل اور چانسلر کاؤنٹ میگوئل لوکس نے انہیں عزت و احترام کے ساتھ شاہی قلعہ میں خوش آمدید کہا۔

سولھویں صدی کے پرتگال میں جپسی "سیگانے" کہلاتے تھے جس کا مطلب تھا کہ گانے والے۔ اسی عرصہ میں ان کے کچھ جتھے انگلینڈ اور سکاٹ لینڈ بھی پہنچے۔ مگر سکاٹ لینڈ اور آئرلینڈ میں پہلے ہی مقامی خانہ بدوشوں کی خاصی آبادی تھی اس لئے انہیں یہ جگہیں

چھوڑنی پڑیں۔

1505ء میں ایک جپسی سردار کلونٹ انتونیو گاگینو کی قیادت میں ایک بڑا لشکر سکوٹش جہاز پر سوار ڈینمارک پہنچا۔ غالباً ان کو سکاٹ لینڈ سے جلاوطن کیا گیا تھا۔ ان کے پاس سکاٹ لینڈ کے بادشاہ جیمز چہارم کا ڈینمارک کے بادشاہ جان کے نام سفارشی خط تھا ایک اور ریکارڈ کے مطابق 1512ء میں کاؤنٹ انتونیو اور اس کے جپسی سویڈن پہنچ کر اسٹاک ہوم میں داخل ہوئے۔ سویڈن کے لوگ ان عجیب و غریب خانہ بدوشوں کو دیکھنے کے لئے ہجوم در ہجوم جمع ہو گئے۔

ناروے میں جپسی پہلے پہل 1544ء میں دیکھے گئے مگر یہ جپسی برطانیہ سے جبری طور پر سمندر کے راستہ جلاوطن کئے گئے تھے۔ انگلینڈ اور سکاٹ لینڈ کے نیم خانہ بدوش لوگوں کی طرح سویڈن اور ناروے کے نیم خانہ بدوش مقامی آبادیوں نے بھی ان ہندوستانی خانہ بدوشوں کو پسند نہیں کیا اور انہیں فن لینڈ اور استونیا کی طرف دھکیل دیا۔ اس عرصہ میں ہنگری کے جپسیوں کی بڑی تعداد پولینڈ اور لتھوانیہ میں مقبول ہو رہی تھی۔

ادھر 1501ء میں جنوبی روس میں بھی جپسی جتھے حرکت میں دیکھے گئے یہ جتھے پولینڈ سے یوکرین کی طرف بڑھ رہے تھے۔ 1721ء میں پولینڈ کے میدانی علاقوں کے جپسی سائبریا کے دارالخلافے تیبولسک میں داخل ہوئے۔ اس طرح پندرھویں صدی سے لے کر اٹھارویں صدی تک یہ پراسرار ہندوستانی خانہ بدوش یورپ کی کل لمبائی اور چوڑائی ناپ چکے تھے۔ نہ صرف یورپ بلکہ وہ افریقہ اور امریکہ کے دور دراز علاقوں میں بھی پہنچ چکے تھے مگر وہاں انہیں نو آباد کار یورپی طاقتوں نے جلاوطن کر کے کالے پانی کے طور پر بھیجا تھا۔

سب سے پہلے سپین نے جپسیوں کو بحراوقیانوس کے اس پار اپنی کالونیوں (جنوبی امریکہ) میں جلا وطن کیا۔ اس کی دیکھا دیکھی پرتگال نے بھی سیگانے جپسیوں کو جلاوطن کر کے زبردستی انگولا، کیپ وردی اور برازیل کی کالونیوں میں بھیجا۔ یہ غالباً سولہویں صدی کا واقعہ ہے۔

سترہویں صدی میں سکاٹ لینڈ نے جپسیوں کو جمیکا اور بار بادو کے جزیروں اور اٹھارویں صدی میں ورجینا کی امریکی کالونی بھیجا۔ بادشاہ لوئی چہارم کے زمانہ میں غلام جپسیوں کو مراعات دی گئی کہ اگر وہ امریکہ کی کالونیوں میں جلا وطن ہونا پسند کریں تو انہیں آزاد کر دیا جائے گا۔ انہیں سزا کے طور پر غلام بنایا گیا تھا۔

صرف انیسویں صدی میں ایسا ہوا کہ جپسیوں کی بڑی تعداد خود امریکہ ہجرت کرنا

شروع ہوئی۔ آج جپسی کیناڈا، "کیلفورنیا، میکسیکو، وسطی امریکہ ارجنٹائن، چلی، برازیل وغیرہ پہنچ چکے ہیں۔ گیتانو، روم، مانش، سیگانے سنتی، کالو ان کے چند ایک قبائلی نام ہیں۔ اس عرصہ میں اپنے ہندوستانی اجداد خانہ بدوشوں کی طرح وہ کوئی زیادہ تبدیل نہیں ہوئے ہیں بلکہ اپنے ماضی کے ساتھ بڑی ڈھٹائی کے ساتھ چپکے رہے اور یہی حقیقت ان کے بارے میں سب سے زیادہ حیرت انگیز ہے۔

ان کے پیشے، زبان، ثقافت اور رسم و رواج ابھی تک وہی ہیں جو ہندوستانی خانہ بدوشی کے زمانہ میں تھے۔ اس معاملہ میں وہ ہندوستان کے انتہائی حب الوطن اور بڑی آن بان والے لوگ ثابت ہوئے ہیں۔

جپسی-2

کسی بھی تاریخ یا سماجی سائنس کے سنجیدہ طالب علم کے لئے یہ حقیقت کشف سے کم نہیں کہ جپسیوں کا بنیادی تعلق ہندوستانی معاشرے سے ہے۔ یا یہ کہ ان کی رومانی زبان کا بنیادی تعلق بھی پراکرت ہندی یا مغربی راجستھان اور گجرات کے خانہ بدوشوں کے لب و لہجہ سے قریب ترین ہے اور یہ کہ ثقافتی تہذیب اور پیشہ ورانہ طور پر بھی جپسی ہندوستانی خانہ بدوشوں کے ساتھ حیرت انگیز حد تک مشابہت رکھتے ہیں۔

مثال کے طور پر رنگ روپ کے اعتبار سے اب بھی بیشتر جپسی ہندوستانی نظر آتے ہیں۔ اور زمانہ حال تک جپسی شہریوں سے الگ تھلگ جنگلوں اور بیابانوں میں ڈیرے ڈالتے رہے ہیں۔ جپسی مادری نظام کے حامل ہیں اور بچوں کی دیکھ بھال عموماً دادیاں اور نانیاں کرتی ہیں وہ لڑکیوں کو چھوٹی عمر میں ہی بیاہ دیتے ہیں۔ اور بڑی لڑکی کی شادی ہمیشہ چھوٹی سے پہلے ہوتی ہے علامت کے طور پر ہر لڑکے کا باپ کچھ پیسے لڑکی والوں کو دیتا ہے۔ لڑکی کا ہاتھ اکثر لڑکے والے مانگنے آتے ہیں تو رشتہ طے ہوتا ہے۔ لڑکی کے کنوار پن کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ شادی بیاہ کے موقع پر قبائلی عزیز و اقارب دور دور سے آکر شامل ہوتے ہیں اور بڑا کھانا' ناچ اور گیتوں سے مہمانوں کی تواضع کی جاتی ہے۔ بچے کی پیدائش کے وقت بھی۔ جپسیوں کی رسم و ریت ہندوستانیوں سے ملتی جلتی ہے۔ جپسی سارہ نام کی کالی میڈونا کی پرستش کرتے ہیں جو غالباً ہندوستانی خانہ بدوشوں کی کالی ماتا کا نعم البدل ہے۔

جپسیوں نے صدیوں کی جہاں گردی کے دوران اپنے اصل وطن سے باہر نہایت نامناسب حالات کے باوجود اپنی تہذیبی اور ثقافتی شناخت کو بہت جوش اور ولولے کے ساتھ قائم رکھا ہے۔ وہ جہاں بھی گئے اور اپنی جڑوں سے خواہ کتنی ہی دور کیوں نہ نکل گئے مگر وہ بڑی ڈھٹائی کے ساتھ اپنے قدیم رسم و رواج کے ساتھ چپکے رہے۔ یہ کہنا کہ کل دنیا ان کا وطن ہے ایک سفید جھوٹ سے کم نہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ باہر کی دنیا کے ہر ملک میں بیگانگی اور اجنبیت ان کا پیچھا کرتی رہی اور اپنے اصل وطن اور اصل گھر کی یاد ان کے

دلوں میں مسلسل سلگتی رہی جس کی تلاش میں وہ دنیا کے کونے میں بھٹکتے رہے۔ مگر ان کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ یہ رہا ہے کہ انسانی ہمدردی اور بھائی چارے کے جذبات یا سماجی تحفظ کا احساس جو وہ دوز کسی ماضی میں اپنے وطن ہی میں کھو آئے تھے پھر انہیں کہیں نہ ملا اور اگر انفرادی طور پر کچھ جپسیوں کو کسی ملک میں ملا تو وہ وہیں پر بس گئے۔

مثال کے طور پر مشرقی یورپ میں انقلاب کے بعد پولینڈ ہنگری اور روس میں سوشلسٹ حکومتوں نے جپسیوں کو قومی اقلیت تسلیم کرتے ہوئے انہیں سماجی ثقافتی اور اقتصادی تحفظ دینے کی کوشش کی اور جپسی منطقی طور پر ان ممالک میں سماج کا ایک ٹھوس حصہ بن گئے۔

مگر مغربی یورپ کے بورژوا صنعتی انقلاب اور کالونیل نظام نے ان کی رہی سہی زندگیوں کو تہہ و بالا کر دیا۔ تیز پھیلتے ہوئے ٹرانسپورٹ کے نظام اور گھٹیا مشینی اشیاء کی افراط نے جپسی دستکاری کو ناکارہ بنا دیا اور وہ بھوکوں مرنے لگے۔ نئے مغربی صنعتی سماج میں ان کی کھپت کا ایک ہی راستہ تھا اور وہ یہ کہ وہ اب استحصالی سرمایہ دارانہ نظام میں پھیلتی ہوئی صنعتی فیکٹریوں کو سستی اجرت پر مزدوری مہیا کریں۔ چونکہ جپسی ایسا کرنے پر تیار نہیں ہوئے تو انہیں ہر صنعتی ملک میں دھتکار کر شہر سے نکال دیا گیا' اور کبھی کبھی یہ شہر سے نکالا جانا اتنا شدید ہوتا کہ پولیس کی مارپیٹ اور جیل خواری کے بعد انہیں دیس سے نکال دیا جاتا۔ 1499ء میں سپین کے بادشاہ فرڈیننڈ اور ملکہ ازابیلہ نے ایک قانون پاس کیا جس کی رو سے جپسیوں کی خانہ بدوشی کو جرم قرار دیا گیا اور جس کی پاداش میں ان کو کوڑے لگانا' ہاتھ پیر کاٹ دینا' عمر قید کی سزا دینا' زندہ جلا دینا' موت کے گھاٹ اتار دینا اور یا پھر جلا وطن کر دینا معمول بن گیا۔ یورپی سماج میں اگلی تین صدیوں تک جپسیوں کو خانہ بدوشی کی زندگی سے روک کر مزدور بنانے کے لئے نت نئے قانون بنائے گئے جن کے ذریعہ ان کی زندگیوں کو جہنم سے بھی بدتر بنا دیا گیا۔ جپسیوں نے سپین میں فلیمینکو ناچ اور گیتوں کی بنیاد اسی دور میں ڈالی۔ جس میں ان کے گہرے دکھوں اور غم و غصہ کا اظہار ملتا ہے۔ مغربی یورپ کے دوسرے ممالک کا رویہ بھی کوئی زیادہ مختلف نہیں رہا بیلجیم کی حکومت نے ان کو اقلیت تسلیم کرنے سے انکار کیا اور وہاں ان کو کبھی کوئی حقوق حاصل نہیں رہے یورپ کے بیشتر ممالک میں جپسیوں کے بارے میں پرانے قانون آج تک لاگو ہیں۔

فرانس میں 1960ء میں قانون پاس ہوا جس کے ذریعہ تمام جپسیوں کو اپنے بال بچوں سمیت روزمرہ کی حرکات و سکنات کے بارے میں پولیس کو رپورٹ درج کروانی پڑتی۔ "اور

تم یہ توقع بھی رکھتے ہو کہ ہمارے بچے تمہارے سکولوں میں پڑھیں؟" ایک جپسی نے کہا۔
مگر یورپ میں ہٹلر کے جرمن نازی فسطائی نظام کے بعد تو جپسیوں کا قتل عام شروع ہو گیا۔ ایک اندازے کے مطابق ان کی آبادی کے لحاظ سے یورپ میں نازیوں کے ہاتھوں مرنے والے جپسیوں کی اوسط یہودیوں سے بھی زیادہ تھی۔
نازی جرمنی میں 38_1937ء کے دوران ہزاروں کی تعداد میں جپسیوں کو گرفتار کر کے نازی کیمپوں میں پہنچایا گیا۔ نازی ایس ایس کے ڈاکٹروں نے ان پر نت نئے نسلی تجربے کئے اور ایس۔ ایس نے بالاخر یہ رائے دی کہ تمام جپسی مردوں کو خصی کر دیا جائے تاکہ جرمن آریہ سماج کے خون کو پاک رکھا جا سکے۔ ان غیر جپسی مردوں کو بھی جنہوں نے جپسی عورتوں سے شادی کر رکھی تھی نامرد کر دیا گیا۔ جپسیوں کے بارے میں نازیوں کی حکمت عملی صاف اور سادہ تھی یعنی "انہیں بیلوں کی طرح خصی کر دو، جلا وطن کر دو یا پھر مار ڈالو۔" مگر جرمن نازیوں کا محبوب مشغلہ مار ڈالنا ہی تھا۔
1941ء میں نازیوں نے کلی طور پر جپسیوں کو مار ڈالنے کا آخری فیصلہ(Solntion Final) کیا۔ صرف پولینڈ کے نازی کیمپوں میں تیس ہزار جپسیوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ بیلجیم، ہالینڈ اور فرانس سے ہزاروں کی تعداد میں گرفتار کر کے آشویز کے بدنام زمانہ کیمپ میں لایا گیا اور موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ کچھ جپسی جوان کیمپوں سے زندہ بچ نکلے مثلاً کولکا اور کراوزر نے ان کیمپوں میں جپسیوں کے قتل عام کے بارے میں دل ہلا دینے والے خوفناک حالات بیان کئے ہیں جو جولائی 1944ء میں رونما ہوئے غرضیکہ روس، یوکرین، کریمیا، اور بحر بالٹک کی ریاستوں میں جہاں کہیں بھی جرمن گئے انہوں نے جپسیوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا۔
یوگو سلاویہ میں جپسیوں اور یہودیوں کے یہ قتل عام 1941ء میں شروع ہوئے ان کو جنگلوں میں لے جا کر گولی مار دی جاتی۔ ان علاقوں کے کسانوں کو جپسی اور یہودی عورتوں اور بچوں کی چیخ و پکار اب بھی یاد ہے جب وہ مارنے کے لئے ٹرکوں میں بھر بھر کر ان علاقوں سے لے جائے جاتے ـــــــ
مگر جپسیوں کو سب سے زیادہ نقصان ہنگری میں اٹھانا پڑا جہاں کل جپسیوں کی تین چوتھائی آبادی رہتی تھی۔ ایک اندازے کے مطابق ہنگری میں دو لاکھ جپسیوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا اور کل یورپ میں پانچ لاکھ جپسیوں نے جان دی۔
کچھ بچ جانے والے لوگوں نے موت کے منہ میں جپسیوں کی بہادری اور زندگی سے

پیار کے بارے میں چشم دید واقعات بیان کئے ہیں۔ مریم نویخ جو جپسیوں کے ساتھ قیدی تھی اور جو اب اسرائیل میں رہتی ہیں بتلایا کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ صبح موت کے گھاٹ اتار دیئے جائیں گے وہ رات بھر اپنے بچوں اور عورتوں کا دل رکھنے کے لئے گاتے اور ناچتے اور پھر صبح سویرے ان کو گولی مار دی جاتی۔ جب لڑنے کا موقع آتا تو وہ نہتے یا چاقوؤں کی مدد سے مشین گنوں سے لیس نازیوں پر پل پڑتے۔ وہ بے شک ایک جیالی نسل کے لوگ تھے۔

گو دوسری جنگ عظیم کے خاتمے پر جپسیوں کے جانی و مالی نقصان کی تلافی اور معاوضے کے لئے بین الاقوامی عدالتوں میں قانون پاس ہوئے مگر آج تک جپسیوں کو کسی قسم کا کوئی معاوضہ نہیں دیا گیا اور نہ ہی جنگ کے بعد کے یورپ نے ان کے بارے میں اپنا رویہ بدلا۔ ظاہر ہے یورپی سماج کی اس سنگدلی نے جپسیوں کو مزید بددل کر دیا۔

چند سالوں سے وہ اپنی ہندوستانی ثقافتی شناخت کے بارے میں سرگرمی سے عمل پیرا ہیں۔ اب وہ جگہ جگہ اپنی رومانو کانگریس منعقد کرتے ہیں اور کل دنیا کے جپسی ایک تنظیمی ڈھانچے میں ڈھلتے جا رہے ہیں۔ بہت سے ماہر لسانیات رومانی زبان اور اس کی ہندوستانی بنیاد کے بارے میں تحقیق میں مصروف ہیں گو کہ رومانی زبان بہت لچک دار ہے اور اس نے دنیا بھر کی زبانوں سے الفاظ اپنائے ہیں مگر اس کی گرامر اور الفاظ کی بنیادی جڑیں ہندی، مارواڑی، گجراتی، سندھی، اور پنجابی زبانوں سے میل کھاتی ہیں۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے اپنی کتاب "گرد راہ" میں لکھا کہ لندن میں سوہو کے مقام پر انہوں نے کچھ جپسیوں کو گاتے سنا جن کے بول یہ تھے۔

"اپر دے رخ آر چڑکلا اینڈ چڑکلی نی"
انڈر دے رخ آر پیارا اینڈ پیاری نی

مارواڑی بھیل آج بھی چڑیا کو چڑکلو ہی کہتے ہیں اور قدیم ہندی میں درخت کو درخ کہتے تھے۔ نکولائی سلیچنکو نے ایک جپسی لوک کتھا کا ذکر یوں کیا ہے۔

"قدیم زمانے میں مضبوط اور حسین لوگوں کا ایک قبیلہ ہندوستان میں دریا کے کنارے آباد تھا ان کے لطیف میٹھے اور پیار بھرے گیتوں میں ایک خوش کن درد تھا اور ان کے وجد آور اور مدہوش کن ناچوں میں زندگی کی ہم آہنگی تھی شاید ان کو اپنے فن کی گہرائی اور قوت کے ناطے یہ پتہ تھا کہ یہ انہیں جگہ جگہ بھٹکنے پر مجبور کرے گی۔"

مگر جپسی اتنے نرم خمیر سے بھی نہیں بنے تھے اور نہ ہی وہ آسانی سے وقت کے ہاتھوں ہار ماننے کو تیار تھے مغرب کی بے روح مشینی دنیا کو دھتکارتے آج بھی کوئی تیس لاکھ جپسی کرہ ارض پر رواں دواں ہیں۔ گو یورپ کے لئے نازیوں کی ظلم کی یلغار اپنے انجام کو پہنچ گئی مگر جپسیوں کے دکھ درد ابھی جوں کے توں ہیں۔

میں 1974ء میں واشنگٹن ڈی سی میں اپنے بچپن کے دوست شیخ اکبر عالم کے ساتھ رہتا تھا ایک صبح کسی نے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا میں نے دروازہ کھولا تو زمانہ کی ماری ایک ادھیڑ عمر کی عورت کو لمبے غرارے میں ملبوس کھڑا پایا وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا کہ

”تم کون ہو اور کیا چاہتی ہو؟“

”کیا یہ اکی کا گھر ہے؟“ اس نے پوچھا ”ہاں!“ میں نے کہا۔

”میں ایک لاطینی جپسی ہوں ایک امریکی مجھے شادی کر کے یہاں لایا اور تنہا چھوڑ دیا میں بہت بھوکی ہوں تم میرے لوگ ہو مجھے تھوڑی مدد کی ضرورت ہے“ وہ آہستہ آہستہ بول کر رک گئی۔ مجھے چونکہ اس زمانہ میں جپسیوں کے بارے میں کچھ علم نہ تھا لہٰذا اسے ایک پیشہ ور گداگر سمجھ کر میں نے دروازہ اس کے منہ پر ہی بند کر دیا۔

جب سے ڈیڑھ دہائی بیت چکی ہے مگر اب بھی جب میں اس بڑھیا کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے اپنے اندر ایک نازی بھوت نظر آتا ہے۔ اور اس کے بعد میں نے اپنی اس لاشعوری وحشت پر اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کیا۔ شاید اسی لئے میں بھی خانہ بدوشوں کی طرح در بدر بھٹکتا رہا ہوں جیسے کہ زندگی نے سچائی اور سکون کے دروازے میرے منہ پر بھی بند کر دیئے ہوں۔

جپسیوں کے نقشِ قدم پر

سندھ میں حیدر آباد ضلع کے میرے قصباتی گاؤں ٹنڈوالہ یار میں ہر سال ستمبر کے پہلے ہفتہ میں مقامی خانہ بدوشوں کا ایک بہت بڑا میلہ لگتا ہے جو راما دیو کے نام سے مشہور ہے تین دن کے اس میلے میں سندھ کے کونے کونے سے لاکھوں خانہ بدوش اور نیم خانہ بدوش اکٹھے ہوتے ہیں جو اپنے رنگین اور بھڑکیلے لباسوں میں ملبوس ناچتے گاتے اپنے اوتار راما دیو جی کو نیاز دیتے ہیں۔ ان خانہ بدوشوں کا تعلق قبل از وید ہندو مذہب سے ہے۔ گو کہ راما دیو کی اصل سمادھی غالباً راجستھان کے ضلع جودھپور میں ہے مگر اب چونکہ ان خانہ بدوشوں کے لئے ہندوستان جانا آسان کام نہیں اس لئے اب وہ یہ میلہ ٹنڈوالہ یار ہی میں مناتے ہیں جہاں کھتری پاڑا میں راما دیو کے نام پر بہت بڑا مندر ہے۔ اس میلے کے توسط سے ایک طرف تو خانہ بدوشوں کے ساتھ میری دلچسپی قائم تھی ہی مگر جب مجھے پتہ چلا کہ بین الاقوامی جپسی خانہ بدوش بھی انہی کا ایک بچھڑا ہوا حصہ ہیں تو اس سوال پر میری دلچسپی اس قدر بڑھی کہ میں نے ان دونوں گروہوں کے درمیان تقابلی تحقیق کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اس ضمن میں 'اسٹار' اور ہیرالڈ میں چند ایک تحقیقی مقالے بھی لکھے۔ بین الاقوامی جپسیوں کی زبان کو 'رومانی' کہا جاتا ہے۔

ایک دن باتوں باتوں میں میرے ایک محقق دوست حلیم بروہی نے اپنی کسی تحقیق کے سلسلہ میں جس کا جپسی سوال سے کوئی تعلق نہ تھا بتلایا کہ مغربی راجستھان میں دریائے لونی کے نام سے ایک کھارا دریا بہتا ہے مگر ایک زمانہ میں یہ دریا میٹھا تھا اور روما کے نام سے مشہور تھا اور جب سے یہ دریا کھارا ہوا یا اس کی میٹھی شاخ سوکھ گئی تو اس کے کناروں پر بسنے والے لوگ اجڑ گئے اور وہاں سے کوچ کر گئے۔

دریائے روما کا نام سنتے ہی میرے ذہن میں ایک سوال ابھرا کہ ایسا تو نہیں کہ جپسیوں کے اولین جتھوں کا تعلق اس دریائی سرزمین سے تھا کیونکہ سومنات کی یلغار کے بعد محمود غزنی کی فوج کی واپسی اسی علاقے سے ہوئی تھی ممکن ہے کہ ان خانہ بدوشوں نے ان کی رہبری کی ہو یا پھر پیچھا کیا ہو۔ بہرصورت ان کا غزنی کی فوج کے ساتھ ایران جانا یا لے

جائے جانے کا تعلق بنتا ہے۔ چونکہ ہمارے لوگ ہمیشہ زبان کی مدد سے اپنی شناخت کراتے ہیں تو گویا یہ وہ لوگ ٹھیرے جو "رومانی بولی بولتے ہیں۔" پراکرت میں "نی" کا مطلب ہوتا ہے کی' غرضیکہ روما کی بولی بولنے والے لوگ جو شاید وقت کے ساتھ ساتھ اس زبان کا نام پڑ گیا۔ رومانی زبان' یعنی کہ روما کی زبان پر جو بلاشک و شبہ مغربی راجستھان کے لب و لہجے سے بہت ملتی ہے۔ لہٰذا میں نے جپسیوں پر کام کے سلسلہ میں مغرب جانے کا تہیہ کر لیا گو کہ اس کام کے لئے مشرقی اور مغربی یورپ کا علاقہ زیادہ موزوں تھا جہاں جپسیوں کی بڑی بڑی آبادیاں ہیں مگر کچھ وجوہ کی بناء پر فی الحال میں نے امریکہ اور کینیڈا پر ہی اکتفا کیا

---

24 جولائی 1987ء کو میں مصری ایئر لائن کے ذریعہ نیویارک کے لئے روانہ ہوا چند گھنٹوں کے بعد جب ہوائی جہاز دوبئ پر اترنے کے لئے نیچے کی طرف جھکا تو مجھے یوں لگا جیسے وہ صحرا تھر میں اتر رہا تھا' جہاز کی کھڑکی سے مجھے ریتیلے سمندر میں چھوٹی چھوٹی سفید بلڈنگز جزیرے کی مانند نظر آئیں اور مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس قسم کے بنجر اور سنسان صحرائی علاقہ نے میرے ملک میں' دوبئ چلو' کا مسحور کن نعرہ جنم دیا تھا۔ مگر تیل کی دولت میں شاید وہ جادو تھا کہ لوگ خود بخود اس قسم کی اجاڑ اور بے روح جگہ میں خودکار غلامی یا جلاوطنی کی زندگی بسر کرنے کے لئے بے قرار تھے۔

چند گھنٹوں کی مزید پرواز کے بعد کویت اور پھر سعودیہ عربیہ پر سے ہوتے ہوئے ہم قاہرہ پہنچے۔ پہلی نظر میں قاہرہ پر مجھے کراچی کا گمان ہوا۔ مگر کراچی کے مقابلہ میں قاہرہ بہت صاف ستھرا اور ہر لحاظ سے بہتر شہر تھا۔ مگر مصر میں مجھے پاکستان کے ساتھ ایک عجیب و غریب ثقافتی و تہذیبی مشابہت کا احساس ہوا۔ مثلاً دریائے نیل کی ڈیلٹائی سرزمین ایک عظیم اور قدیم افریقی تہذیب کی وارث تھی۔ مگر اب وہ قدیم کالے مصری سماج کی نچلی ترین پرت کے طور پر نظر آتے ہیں جب کہ سفید اور فاتح عرب اوپری سطح پر حکمراں طبقہ کے طور پر۔ بالکل اسی طرح جیسے وادی سندھ دریا کی قدیم دراوڑ تہذیب کے لوگ جو اب نچلی ذاتوں کا حصہ تھے اور بعد کے کوکیشائی حملہ آوروں کی اولاد پاکستانی سماج کا حکمران طبقہ۔

پیرس ہماری اگلی منزل تھی اور پھر زندگی کے ایک طویل ترین دن کے بعد شام کو نیویارک پہنچے۔ حسب معمول لبرٹی کے مجسمے نے کینیڈی ایئرپورٹ پر اترنے سے پہلے ہمارا استقبال کیا۔

نیویارک میں اگلے چار ماہ تک بچپن کے ایک دوست کے گھر ٹھکانہ رہا جو وسطی میں

ہٹن میں رہتا تھا۔ اور پھر میری زندگی میں جیسے ہوتا آیا ہے میری روح اور جسم دو متضاد دنیا میں بٹ گئے۔ یعنی کہ رات بیتانے کے لئے تو گورے لوگوں کی منتخب بستی میں رہتا جب کہ دن بھر جپسیوں کی تلاش میں کالے اور ہسپانوی ہارلیم کا طواف کرتا۔ یا پھر یہودیوں کے مخصوص علاقہ براٹن کا ساحل اور یا پھر اطالوی مافیا کا مشہور گڑھ بروکلین ہائٹس اور چائنا ٹاؤن وغیرہ میں مٹر گشت کرتا۔ مگر جپسیوں کو ڈھونڈ نکالنا جان جوکھوں کا کام تھا۔ کیونکہ ایک تو امریکی لوگ خود خانہ بدوشوں کی سی زندگی گزارتے تھے اور دوسرے جپسی امریکی نو آباد کار زندگی کو ٹھکراتے ہوئے نہ ہی تو گرین کارڈ کے قائل تھے اور نہ ہی ٹیکس ادا کرنے والی نوکریوں کے۔ وہ تو اب بھی پراسرار سائیوں کی طرح ادھر ادھر بھٹکتے رہتے۔ اور اس طرح جپسیوں نے امریکہ میں بھی اپنے بارے میں وہ رومانی تاثر قائم کر رکھا تھا جس کے لئے وہ دنیا بھر میں مشہور ہیں۔

"ان کی آن کا تو اندازہ لگاؤ۔" میں نے سوچا کہ عام پاکستانی کیا امیر اور کیا غریب امریکی شہریت حاصل کرنے کے لئے اپنا گھر بار بال بچے اور مقامی شہریت کو خیرباد کہنے کے لئے تیار رہتا ہے اور دوسری طرف یہ جپسی خانہ بدوش تھے جو امریکہ تو کیا دنیا کے کسی ملک کی شہریت کو گھاس ڈالنے کے لئے تیار نہ ہوئے۔

ایک دن یوں ہی گھومتے وقت ایک شیدی دوست نے مجھے صلاح دی کہ مجھے ایک آزاد اور لاابالی لوگوں کی بستی میں جو گرین ویلج کے نام سے مشہور ہے جانا چاہئے جہاں چھٹی کے دن شغلی فنکار، موسیقار، مصور، ڈھولچی، مداری، جوتشی اور شعبدہ باز جمع ہوتے ہیں۔ اور واشنگٹن سکوائر نام کے ایک بڑے پارک نما چوک پر اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں اور یہ کہ جوتشیوں کی شکل میں اکثر وہاں جپسی بھی آتے ہیں۔ اس کے بعد ہر ویک اینڈ پر میں نے پورا پورا دن واشنگٹن سکوائر پر گزارنا شروع کر دیا مگر ابھی تک مجھے کوئی جپسی وہاں نظر نہیں آیا۔ ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ ایک کالی اور موٹی عورت ہندوستانی طریقہ پر آلتی پالتی مار کر فٹ پاتھ پر بیٹھی ہے اور اس کے سامنے کپڑے پر جپسی منکوں کے ہاتھ سے بنائے ہوئے گلے کے ہار، بازو بند اور دستکاری کے کچھ دیگر نمونے رکھے ہیں جنہیں وہ بیچ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک آدھ جوتش پر لکھی ہوئی کتاب بھی پڑی تھی۔ اس طرح وہ یہ سامان بھی بیچتی تھی اور لوگوں کو ہاتھ دیکھ کر قسمت کا حال بھی بتلاتی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے گنواریہ اور شاہی خانہ بدوش عورتیں یاد آئیں جو بنڈوالہ یار اور حیدر آباد کے بازاروں میں فٹ پاتھ پر اسی طرح بیٹھ کر دستکاری کی چیزیں بیچتی تھیں۔ ان کے ماتھے پر

ہندو سادھوؤں کی طرح سفید رنگ کی لکیریں بنی تھیں۔ اس کا نام عشیہ کارا بیکرو تھا۔

"کیا تمہیں کار کا مطلب پتہ ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"ہاں" اس نے کہا "رومانی زبان میں اس کا مطلب ہے کالا یعنی سیاہ" اس نے بتلایا۔

کیا تمہیں معلوم ہے کہ یہ لفظ میری پاکستانی زبان کا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں میرے لوگ بہت عرصہ گزرا ہندوستان آئے تھے۔ اور ہمارا تعلق ہندوستان کے خانہ بدوشوں سے ہے۔" اس نے کہا۔

میں اس تاریخی دریافت پر اس قدر خوش ہوا کہ جوش میں آکر جپسیوں کے بارے میں ڈھیر سارے سوال ایک سانس میں کر ڈالے جیسے وہ کوئی عجائب گھر کا کوئی نادر نمونہ تھی اور پل بھر میں غائب ہو جائے گی۔"

"تم ضرورت سے زیادہ باتیں کرتے ہو اور مجھے اپنے لوگوں کو تم پر ظاہر نہیں کرنا چاہئے۔" اس نے کرختگی سے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔"

"مگر میں تو تمہارے لوگوں میں سے ہی ہوں۔ پرانے دیس سے تمہیں تلاش کرنے ہی آیا ہوں۔ پھر تمہیں ان لوگوں کو مجھ سے کیوں چھپانا چاہئے۔" میں نے احتجاج کے طور پر کہا۔

"تمہاری باتوں سے تو پتہ چلتا ہے کہ تم کوئی پولیس ایجنٹ ہو" اس نے طنزیہ لہجہ اپناتے ہوئے کہا۔

اس کا طعنہ سن کر میرا رنگ فق ہو گیا اور میں شرمندگی کے مارے کچھ دیر یوں ہی چپ چاپ بیٹھا رہا۔ اور کارا کنکھیوں سے میرے چہرے کا تاثر لیتی رہی۔ اس عرصہ میں کچھ گورے مرد اور عورتیں اس کی چیزوں کو ایک نظر گھور کر گزرتے رہے۔

"یہ لوگ میری چیزیں خریدنا نہیں چرانا چاہتے ہیں" وہ اندر ہی اندر بڑبڑائی۔

اتنے میں ایک گوری عورت وہاں آکر رکی اور کچھ دیر کارا کی چیزوں کا جائزہ لینے کے بعد میری طرف گھور کر دیکھا اور پوچھا۔

"کیا تم اس خاتون کے ساتھی جپسی ہو؟"

"ہاں" میں نے کہا۔ "یہ خاتون میری بہن ہے۔"

کارا کے منہ پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی پھر وہ اپنے تھیلے کے اندر سے بانسری نکال کر بجانے لگی اور اس کی چمکیلی آنکھوں سے شرارت جھلکنے لگی۔

"تم کیا چاہتے ہو؟" اگر تمہیں کسی جپسی عورت کی تلاش ہے تو میں تمہیں ایک بہت

خوبصورت عورت سے ملوا سکتی ہوں مگر وہ بہت ظالم بھی ہے تمہارا دل توڑ دے گی۔" اس نے طنزیہ لہجہ جاری رکھا۔

"بہن کارا مجھے غلط مت سمجھو" میں نے پہلی بار جذباتی ہو کر کہا۔ تم ہمارے گمشدہ لوگوں میں سے ہو اور میں تمہاری تلاش میں یہاں پہنچا ہوں۔ میری بات شاید تم کو عجیب لگے مگر یہ سچ ہے۔ مجھے ہر حالت میں تمہارے لوگوں سے ملنا ہے۔

"اچھا تو جاؤ ملو تمہیں کون روکتا ہے" اس نے متانت سے جواب دیا۔

"مگر کہاں" مجھے شروعات کے لئے رابطہ چاہئے" میں نے زور دیا۔

"رابطہ؟" جنگلوں میں جاؤ' پہاڑوں میں ڈھونڈو ____ شاید مینو پلس کے شہر میں تمہارا رابطہ ہو جائے۔

"مینو پلس کا شہر وہاں کہاں ہے؟" میں نے اسے سنجیدگی سے لیتے ہوئے پوچھا۔

"یہ تم کسی ٹریول ایجنٹس سے پوچھ سکتے ہو؟" اس نے اسی سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔

مجھے جب یہ احساس ہوا کہ وہ ابھی تک میرا مذاق اڑا رہی ہے تو مجھے ہلکا سا غصہ کا احساس ہوا اور میں نے زیر لب بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

"کارا تم بھی کان کھول کر سن لو۔ چاہے تمہیں کتنا ہی برا لگے پر میں تمہارا گھر دیکھنے اور تمہارے خاندان سے ملنے ضرور جاؤں گا۔" میں نے ہٹ دھرمی سے کہا۔

"گھر! تم نے آج تک کتنے جپسیوں کے گھر دیکھے ہیں؟ کیا تمہارے ملک میں خانہ بدوشوں کو گھر بار مل گئے؟ اگر ہمارے گھر ہوتے تو ہم دنیا بھر میں ٹھوکریں کھاتے کیوں پھرتے؟" اس نے غمگین آنکھوں سے مجھے گھورتے ہوئے پوچھا ____

تھوڑی دیر کے لئے میں سناٹے میں آ گیا اور یوں ہی چپ چاپ بیٹھا رہا۔ اور مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں اس عورت کو اپنے بارے میں کس طرح یقین دلواؤں۔ نیو یارک کے فٹ پاتھ پر اس کسمپرسی میں بیٹھے ہوئے مجھے سندھ میں شامی (جوتشی) خانہ بدوشوں کا کیمپ یاد آیا جہاں گزرے سال مجھے اس قسم کا واقعہ پیش آیا تھا۔ دیہاتی بیابان میں گھاس پھوس کی بنی شامیوں کی جھونپڑیاں عورتوں' بچوں' کتوں' اور گدھوں کے علاوہ بالکل خالی سی تھیں۔ ان کے بیشتر مرد اپنے پراسرار دھندے میں مشغول دور دور تک نکل گئے تھے۔ کچھ ایران' عراق اور سعودی عرب تک پھیری کر آتے تھے۔

جب میں کیمپ میں پہنچا تو مجھے اپنی دستکاری کا خریدار سمجھ کر انہوں نے میری بڑی آؤ بھگت کی۔ شامیوں کی سوئی دھاگے کی دستکاری بہت ہی اعلیٰ قسم کی ہوتی ہے اور ان کی

جوگی رلیاں ہزاروں روپے کی لاگت کی ہوتی ہیں۔ مگر جلد ہی وہ مجھے اپنے متعلق عجیب و غریب سوالات کرتے دیکھ کر میرے بارے میں فوراً مشکوک ہو گئے اور مجھے کیمپ چھوڑ کر چلے جانے کو کہا۔ اور جب میں کھسیانا سا ہو کر کیمپ سے باہر نکلا تو کسی نے پیچھے سے یہ جملہ کہا۔

"بڑا آیا ہے ہمدرد بن کر۔ اتنے برسوں کہاں تھا۔ پولیس ایجنٹ کہیں کا۔"

گو میری دورجنوں خانہ بدوش قبائل سے دوستی ہے مگر آج تک میں شامی جوتشی قبیلے کے ایک فرد سے بھی دوستی نہ لگا سکا اور نیویارک کے شامی جپسی ان سے کوئی زیادہ مختلف نظر نہیں آئے۔

"اچھا کارا! اب میں سمجھا تو تم شامی قبیلے سے تعلق رکھتی ہو۔ پاکستان میں شامی اب بھی تمہاری طرح قسمت کا حال بتلاتے ہیں اور بالکل تمہاری طرح انتہائی پراسرار اور شکی مزاج ہیں۔"

"شامن! شامن!" کہہ کر اس نے کچھ سوچتے ہوئے سر ہلایا۔

شام ہونے کو تھی اور تمام دن میں نے کارا کے ساتھ سر کھپاتے گزار دیا تھا۔ مگر اب بھی وہ مجھ سے اتنی ہی بے اعتنائی برت رہی تھی جتنی شروع کے وقت۔ شاید وہ مجھ سے اس لئے ناراض تھی کہ اگر میں ان ہی میں سے تھا تو پھر گورے لوگوں کی طرح عجیب و غریب سوالات کی بوچھاڑ کر کے اتنی اجنبیت کا مظاہرہ کیوں کر رہا تھا۔ میں نے دیسی انداز اپناتے ہوئے پینترا بدلا اور اس سے پوچھا۔

"کارا تمہیں بھوک لگی ہو گی۔ صبح سے دکان سنبھالے بیٹھی ہو کچھ کھانے کے لئے لے آؤں؟۔"

"ہاں پینے کے لئے کچھ بیئر لے آؤ" اس نے فوراً حکم دیا "اور ہاں شمپیل لانا۔" میں دور نکل گیا تو اس نے پیچھے سے آواز دی۔

بیر پینے کے بعد وہ کچھ مدہوش سی ہو گئی اور اس نے اپنی گرد و پیش کی دنیا کو زور زور سے کوسنا شروع کر دیا۔

"گورے لوگ صرف ایک کام جانتے ہیں۔ غریب عوام کی لوٹ مار اور فوجی اڈے قائم کرنا اور ایک سے ایک بہتر ہتھیار بنانا۔ دیکھو تو لاطینی امریکہ' ایشیا اور افریقہ کا انہوں نے کیا حال کر دیا ہے۔" وہ کچھ دیر سانس لینے کے لئے رکی اور پھر چیخنے لگی۔

"ان سے کہو کہ وہ اپنی منحوس انگلیاں نکاراگوا سے باہر نکالیں۔ ان سے کہو کہ وہ دنیا فتح تو کر سکتے ہیں مگر کنٹرول نہیں کر سکتے۔ اس کی نجات ہمارے ہی دم سے ہو گی۔"

پاس سے گزرتے گورے لوگ اس کی باتیں سننے کے لئے کچھ دیر رک جاتے اور پھر اس کی گالیاں سن کر ناک بھوں چڑھاتے ہوئے آگے نکل جاتے۔ مگر ایک گورے نوجوان نے آسماں کی طرف سیدھی انگلی اٹھا کر عشیہ کو ایک فحش گالی دی۔ عشیہ نے بھی اسی زبان میں اس کی ایسی تیسی کر دی۔

"دیکھا تم نے؟" اس نے شیرنی کی طرح بپھر کر کہا۔ "گورے لوگ کتنے بھدے اور بدنما آباد کار ہیں مگر ہم ان کی حرام زدگیوں میں شامل نہیں ہوں گے۔ یہ سب نازی ہیں میں نوریم برگ کی شاہد ہوں" ..... اور وہ بے لگام بولتی گئی۔

میں عشیہ کارا کو اس حالت میں دیکھ کر کچھ گھبرا سا گیا کہ کہیں پولیس والا آ کر ہم دونوں کی خبر نہ لے کیونکہ واشنگٹن سکوائر کے چوک پر شراب پینا ممنوع تھا اور عشیہ کارا آپے سے باہر ہو رہی تھی۔ میں نے اسے ٹھنڈا کرنے کے انداز میں کہا۔

"کارا لگتا ہے تم تھک گئی ہو۔ بھوک لگی ہو گی کھانے کے لئے کچھ لاؤں؟۔ اس کے منہ سے جھاگ اڑ رہے تھے وہ کچھ دیر خاموش ہو کر آہستہ سے بولی۔

"کچھ پیزا اور سوسیج لے آؤ!"

اور میں جلدی سے کھانا لینے کے لئے دوڑ گیا۔ جب میں واپس لوٹا تو کیا دیکھتا ہوں کہ عشیہ فٹ پاتھ کی پگڈنڈی پر جھوم جھوم کر ہندوستانی طرز پر ناچ رہی تھی اور وہ اپنے بھاری بھرکم جسم کے باوجود ایک ہلکے پھلکے پرندے کی مانند ہوا میں ڈول رہی تھی۔ اس کا ناچنے کا انداز بے حد دلپذیر تھا۔ اور ناچتے وقت ہلکے سے کچھ گنگنا بھی رہی تھی۔ کھانا آنے پر وہ چپ چاپ زمین پر بیٹھ کر کھانے لگی۔ اس دوران ہم نے ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کی جیسے ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے سامنے کسی وجہ سے پشیمان ہوں۔ پھر اس نے اپنی دکان کو سمیٹ کر ایک بڑے سے تھیلے میں بھر لیا اور مجھے ملے جلے جذبات کے ساتھ سلام کیا اور چل دی۔

"کیا کل بھی تم یہاں دکان لگاؤ گی؟" میں نے آواز دے کر پوچھا۔

"کون جانے؟" اس نے گھوم کر ایک اچٹتی سی نظر مجھ پر ڈالی اور سڑک کے ایک کونے پر پہنچ کر بھیڑ میں کھو گئی ____ اور پھر اگلے چار ماہ کے دوران جب تک میں نیویارک میں رہا پھر اسے کبھی نہیں دیکھا۔

غلاموں کی تجارت

شیدی

پاکستان میں شاید تھوڑے ہی لوگوں کو احساس ہو کہ اس ملک میں صدیوں سے لاکھوں کی تعداد میں افریقی نسل کے لوگ آباد ہیں۔ جن کو سندھ میں شیدی اور بلوچستان میں مکرانی کہتے ہیں۔ شیدی کا لفظ افریقی زبان کے ایک لفظ سدی کی بگڑی ہوئی صورت ہے جو حقیقت میں عربی کے لفظ سیدی کی ایک شکل ہے جس کا مطلب ہے آقا یا مالک۔ شیدی لوگ زیادہ تر جنوبی سندھ کے ساحلی علاقہ میں آباد ہیں جب کہ مکرانیوں کا تعلق بلوچستان کے ساحلی علاقہ مکران سے ہے۔ شیدی سندھی زبان بولتے ہیں اس لئے سندھی کہلاتے ہیں جب کہ مکرانی بلوچی زبان کے حوالے سے اپنے آپ کو بلوچ کہلوانا پسند کرتے ہیں۔ مکرانیوں کی ایک بڑی آبادی محنت مزدوری کرنے کے سلسلہ میں نقل مکانی کر کے کراچی اور سندھ کے دیگر شہری علاقوں میں آباد ہو گئی ہے۔ اور ان کی ایک بڑی تعداد بہتر روزگار کی تلاش میں عرب امارات یا ایران کی طرف بھی چلی گئی ہے۔

یہ معلوم کرنے کے لئے کہ یہ افریقی باشندے ہمارے ساحلوں تک کیسے پہنچے۔ ہمیں اپنی تاریخ کے ایک نہایت شرمناک اور انسانیت سوز باب کو بے نقاب کرنا پڑے گا۔ ان افریقیوں کے بیشتر اجداد وہ چھوٹے چھوٹے بچے اور بچیاں تھے جن کو ایک زمانہ میں عرب اور پھر یورپی نو آباد کار تاجروں نے اندرون افریقہ کے قبائلی دیہاتوں سے اغواء کر کے غلام منڈیوں میں یوں بیچ دیا تھا جیسے کہ وہ انسان نہیں تھے بلکہ جانور تھے اور یا پھر گھریلو کھپت کی بازاری اشیاء تھے۔ افریقہ کے مغربی ساحل پر انسانوں کی بردہ فروشی کے بارے میں کافی کچھ لکھا جا چکا ہے۔ جہاں کروڑوں کی تعداد میں انسانوں کو جبراً یورپی نو آبادیوں میں بیچا گیا اور جن کی اولاد آج ہمیں شمالی امریکہ سے لے کر جنوبی امریکہ کے ممالک اور بالخصوص جزائر غرب الہند میں ملتی ہے۔ انسانوں کی یہ بھیانک تجارت اتنے بڑے پیمانے پر کی گئی کہ آج تک افریقہ کا وہ ساحل، ساحل غلامان یعنی Slave Coast کے نام سے مشہور ہے۔

مگر افریقہ کے مشرقی ساحل پر غلاموں کی اس تجارت پر مکمل طور پر عرب تاجروں کی اجارہ داری تھی جس کے بارے میں ابھی تک تاریخ خاموش ہے۔ اس علاقہ میں زنجبار اور مسقط کے مقام پر افریقی غلاموں کی بہت بڑی منڈیاں تھیں جہاں سے عرب تاجر انہیں ہندوستان اور جنوبی ایشیا کے دیگر ملکوں کو تھوک کے حساب سے بیچتے۔ ہندوستان میں ان غلاموں کے فوری خریدار زیادہ تر سلطان۔ نواب۔ راجہ۔ رؤسا اور جاگیردار تھے۔

کراچی اس زمانہ میں کلاچی کے نام سے مچھیروں کی چھوٹی سی بستی تھی جس طرح کہ بمبئی بھی اس زمانہ میں کولابہ کے نام سے کولی مچھیروں کی چھوٹی سی ساحلی بستی تھی۔ یورپی نو آبادکاری کے زمانہ میں جب یہ دونوں بستیاں بندرگاہ کی حیثیت اختیار کرنے لگیں تو 1794ء میں ایک انگریز ملاح کیپٹن چارلس کے مطابق کراچی بندرگاہ کا کل سالانہ ریونیو اکیس لاکھ روپے ہوتا تھا جو تمام کا تمام افریقی غلاموں کی خرید و فروخت کے طور پر کمایا جاتا تھا۔ کراچی اور بمبئی میں غلام عرب جہازوں کے ذریعہ لائے جاتے ان بدنصیب انسانوں کو مقامی تاجروں کے ہاتھوں فروخت کر دیا جاتا جو انہیں ہندوستان کے کونوں کونوں تک پہنچا دیتے۔

افریقہ کے سفید ساحلوں سے ملحقہ اندرون علاقوں سے غلام حاصل کرنے کے لئے یہ تجار بہت ظالمانہ حربے استعمال کرتے۔ ایک عام اور آسان طریقہ تو یہ تھا کہ افریقی قبائلی جنگوں میں پکڑے جانے والے قیدیوں کو عرب تجار قبائلی فاتح سرداروں سے رنگین کپڑوں۔ موتیوں۔ منکوں سے بنے زیورات یا شراب کے بدلے خرید لیتے اور پھر ساحلوں پر منتظر عرب کشتیوں میں سوار کر کے غلام منڈیوں کا رخ کرتے۔

ایک اور عام طریقہ بچوں کو اغواء کرنے کا تھا۔ اور کہا جاتا ہے کہ اس کام کے لئے عرب عموماً پٹھان خرکاروں کو استعمال کرتے۔ محمد صدیق مسافر کے مطابق جن کے والد کو بچپن میں غلام بنا کر زنجبار سے سندھ لایا گیا تھا۔ مشرقی ساحل کے بیشتر غلاموں کو عرب تاجر اور پٹھان خرکاروں نے ہندوستان اور اس کے ملحقہ علاقوں میں فروخت کیا۔

تاجروں اور خرکار ٹھگوں کی پارٹیاں تجاروں کے بھیس میں جنگلات میں گھری ہوئی دیہاتی بستیوں میں جاتیں اور بچوں میں مٹھائی۔ کھٹ میٹھے یا گڑ اور چنے وغیرہ تقسیم کرتیں۔ جب بچے ان سے گھل مل جاتے تو وہ انہیں بتلاتے کہ ساحل پر لنگر انداز ان کی کشتیاں اس قسم کے کھانوں سے لدی ہوئی ہیں اور اگر وہ ان کے ساتھ چلیں تو خوب کھانے کو ملے گا۔ اور اس طرح ننھے منے معصوم بچے اور بچیوں کو دھوکا دے کر کشتیوں تک لایا جاتا اور

جب بچوں کی تعداد خاصی ہو جاتی تو اچانک لنگر اٹھا کر انہیں اغواء کر کے لے جاتے اور پھر غلام منڈیوں میں انہیں بیچ دیتے۔

مگر انسانوں کے ان وحشی بیوپاریوں کا سب سے محبوب مشغلہ یہ تھا کہ عرب ٹھگوں کی ہتھیار بند پارٹیاں رات کے اندھیرے میں جنگل کی کسی الگ تھلگ سوئی ہوئی بستی کو گھیر کر اس کو آگ لگا دیتیں اور جب جلتی ہوئی بستی کے لوگ جان بچانے کے لئے ادھر ادھر بھاگتے تو ان پر حملہ ہو کر عورتوں۔ مردوں اور بچوں کو پکڑ کر غلام بنا لیتے اور پھر ساحل پر لنگر انداز کشتیوں میں بھر کر غلام منڈیوں میں لے آتے۔ مگر یہ کام عموماً وہ خود نہ کرتے بلکہ اکثر اوقات قبائلی دشمنیوں کا فائدہ اٹھا کر ایک قبیلے سے دوسرے دشمن قبیلے پر حملہ کرواتے اور پھر پکڑے جانے والے قیدیوں کا معاوضہ ادا کر کے خرید لیتے۔ اس طرح افریقہ میں غلاموں کی تجارت کو جاری رکھنے میں افریقی سرداروں اور بادشاہوں کا بہت بڑا ہاتھ تھا جس کے بغیر بردہ فروشی کی اس تجارت کو اتنے بڑے پیمانے پر اور اتنے طویل عرصہ تک جاری رکھنا ممکن نہ تھا۔ ان بدنصیب غلاموں میں ہارے ہوئے بادشاہ، سردار اور ان کے اہل و عیال بھی شامل ہوتے۔ مگر ان کی اکثریت شکست خوردہ قبائلی جنگ بازوں کی ہوتی تھی۔

رچرڈ برٹن کی کتاب "تاریخ سندھ" کے مطابق سندھ کے بیشتر افریقی غلام مسقط اور عربیہ کے مشرقی ساحل کی دیگر غلام منڈیوں سے لائے گئے تھے۔ میروں کی حکومت کے زمانہ میں چھ سات سو شیدی غلام ہر سال سندھ لائے جاتے تھے جنہیں زنجیباری یا ممباسی کہا جاتا تھا۔ عام طور پر ان کی قیمت 40 روپے سے لے کر 150 روپے تک فی غلام ہوتی۔ چونکہ لڑکیوں کی کھپت زیادہ تھی اس لئے انہیں زیادہ تعداد میں لایا جاتا اور ان کی قیمت بھی نسبتاً زیادہ تھی۔ رچرڈ برٹن کے مطابق سندھ میں شیدیوں کی اکثریت کوٹو اور مونڈو کے علاقوں سے لائی گئی جو ساحلی علاقوں سے ملحقہ ہیں۔ ان غلاموں کے بیانات کے مطابق ان کے لامو۔ بارہ۔ ماجی اور کینکوئر کے چند ایک بڑے شہر بھی تھے۔ اور ان کی اکثریت مسلمان خاندانوں سے تعلق رکھتی تھی۔ ان شیدی غلاموں کے چند ایک قبیلے مندرجہ ذیل ناموں سے تھے۔

مکوا۔ مڑیما۔ مڑیما بھائی۔ توبڑ۔ یاس۔ میاسینڈا۔ مزگرا۔ متوبی۔ مکامی۔ ساگر۔ مدوئی۔ مکوڈونگو۔ نزلز میڑا۔ نیامزی۔ ٹیمالوئی۔ ظالما۔ زنز سیگری وغیرہ۔

افریقہ کے طبعی نقشہ پر ایک نظر ڈالنے کے بعد یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ مندرجہ

بالا ناموں کا تعلق سینٹرل افریقی ریپبلک۔ ایتھوپیہ۔ سوڈان۔ تنزانیہ۔ کینیا۔ کانگو۔ انگولا' گھانا۔ مالی یوگنڈا اور موزمبیق کے دریاؤں۔ پہاڑوں۔ شہروں یا لسانی و قبائلی گروہوں و غلام منڈیوں سے بنتا ہے۔

غرض کہ سینٹرل افریقہ سے ان غلاموں کو قیدی بنا کر ایک طویل اور اذیت ناک سفر کے بعد تنزانیہ کے ایک شہر طبورہ لایا جاتا۔ طبورہ کے شہر میں آج بھی اس کا روان سرائے کے کھنڈرات موجود ہیں جہاں غلاموں کے لئے رات بسر کرنے یا لمبے عرصہ تک ٹھہرائے جانے کا بندوبست تھا۔ طبورہ سے ان غلاموں کو تنزانیہ کے مشرقی ساحل پر بیگو مایو کی بندرگاہ پر لے جایا جاتا۔ بیگو مایو کے ساحل پر آج بھی ایک بہت بڑا سایہ دار درخت کھڑا ہے جس کے موٹے تنے کے ساتھ بڑی بڑی لوہے کی کڑیاں لٹک رہی ہیں جن کے ساتھ زنجیروں میں غلاموں کی قطاروں کو باندھ دیا جاتا تاکہ وہ بھاگ نہ سکیں۔

غلامی کی تجارت کے اس طویل راستہ پر جگہ جگہ آم کے درخت اب بھی کھڑے ہیں جو سفر کے دوران غلاموں کے کھائے ہوئے آم کی گٹھلیوں سے اگے تھے۔ بیگو مایو سے ان غلاموں کو کشتیوں پر سوار کر کے زنجیبار کی غلام منڈی میں لایا جاتا۔ زنجیبار صدیوں تک دنیا کے اس خطہ میں سب سے بڑا اور مشہور غلاموں کا بازار رہا ہے۔ البرٹ موراویہ نے زنجیبار کا نقشہ یوں کھینچا ہے۔

''وسطی افریقہ کے اندرونی علاقوں اور پرامن دیہاتوں میں عرب تاجروں کے ہاتھوں پکڑے جانے والے حبشیوں کو ایک طویل اور خوفناک سفر سے گذرنا پڑتا۔ جس میں ان کو جانوروں کی طرح ایک لمبی قطار میں زنجیروں کے ذریعہ باندھ کر ہانکا جاتا۔ مگر جب وہ زنجیبار پہنچ جاتے تو انہیں نہلایا دھلایا جاتا۔ ان کو خوشبو دار تیل لگایا جاتا۔ اور ان کی عمر اور جنس کے مطابق انہیں ہار مالائیں اور زیورات کے ذریعہ سجایا جاتا۔ اس کے بعد جشن کی صورت میں قطار در قطار اپنے اپنے مالک تاجروں کے پیچھے ان کے حبشیوں کو شہر کے بیچوں بیچ نمائش کے طور پر غلام منڈی میں لایا جاتا۔ شہر سے گزرتے وقت تاجر اپنی اشیاء کی تعریف و خصوصیات زور زور سے بیان کرتے چلتے۔ اور جب کوئی گاہک ملتا تو یہ قافلہ رک جاتا اور گاہک ٹٹول ٹٹول کر ایک غلام کا جائزہ لیتا۔ گاہکوں کا یہ جائزہ بالکل اسی طرح ہوتا جیسے گھوڑوں یا بھیڑ بکریوں کو خریدتے وقت گاہک جانوروں کی منڈی میں مظاہرہ کرتے ہیں۔ یعنی خریدار اپنے ہاتھوں سے ٹٹول کر غلام کے ہاتھ۔ پاؤں۔ دانت اور بلا کسی شرم و جھجک اس کے بدن کے خفیہ حصوں کا بھی معائنہ کرتا۔ پھر وہ غلام کو بھگا کر۔ اچھلوا کر اور نچا کر

دیکھتا اور پوچھتا کہ اسے کوئی بیماری تو نہیں اور یہ کہ وہ رات میں سونے کے وقت خراٹے تو نہیں لیتا۔ اور جیسے ہی کوئی خریدار اسے خرید لیتا تو تاجر اس غلام کے تمام سجاوٹ والے کپڑے لتے و دیگر زیورات وغیرہ اتار کر غلام کو نئے مالک کے حوالے کر دیتا۔ نیا مالک اُسے رسی سے باندھ کر گھسیٹتا اور مارتا پیٹتا ہوا اس طرح لے جاتا جیسے نئے جانوروں کو نئی جگہ کی طرف لے جایا جاتا ہے۔"

بقیہ غلام جونہی مارکیٹ میں پہنچتے تو ایک ایک کر کے انہیں اونچے پلیٹ فارم پر کھڑا کر کے نمائش کی جاتی اور پھر بولی لگا کر بیچ دیا جاتا۔ یہ غلام خریداروں کی نظروں میں ذاتی ملکیت کے طور پر اشیاء سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ اور اس امر میں ان کی عمر یا جنس یا ان کے دیگر خاندانی رشتوں وغیرہ کا بھی کوئی خیال نہ رکھا جاتا۔ اور بکنے کے بعد اسے ایک گھریلو جانور کی طرح رکھا جاتا یعنی اچھی طرح ہے یا پھر بہت بری طرح سے مگر دونوں ہی صورتوں میں مالک کی نگاہ میں اس کی انسانی حیثیت کی کوئی قدر نہ ہوتی۔ اور نئے آقا کا رویہ اس کی نئی قسمت بن جاتی۔

مالک نیک نیتی کے ساتھ یہ ایمان رکھتے تھے کہ ان کی اپنی ثقافت ہی اٹل حقیقت ہے اور حبشیوں کی رنگ و نسل کو دیکھ کر جو ان سے بہت مختلف تھی وہ یہ نتیجہ نکالتے تھے کہ حبشی انسان نہیں ہیں بلکہ وحشی جانوروں ہی کا ایک حصہ ہیں دوسرے الفاظ میں غلاموں کے یہ خریدار آقا جدید قسم کے نسل پرست تھے اور قوم پرستی کی بنا پر وہ غلاموں کو انسانی بھائی چارے کا درجہ دینے کو بھی تیار نہ تھے۔ مگر انسان کی فسطائی تاریخ میں یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ جرمن قوم پرست نازیوں نے یہی سلوک یہودیوں۔ جپسی خانہ بدوشوں اور کمیونسٹوں کے ساتھ روا رکھا تھا۔ اور یہی سلوک جنوبی افریقہ کی گوری نسل پرست حکومت وہاں کی حبشی عوام کے ساتھ آج بھی روا رکھے ہوئے ہے۔ جس کے بارے میں انسانیت کے کانوں پر نہ پہلے کبھی جوں رینگی اور نہ ہی اب۔

محمد صدیق مسافر جن کے بارے میں تفصیلی ذکر تو بعد میں آئے گا نے اپنی کتاب "غلامی اور آزادی کے عبرت ناک نظارے" میں سندھ کے غلام شیدیوں کی حالت کے بارے میں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ مسافر نے یہ حالات اپنے والد اور ان کے رفقاء کی آپ بیتیوں سے اخذ کئے ہیں۔ جو بچپن میں غلام بنا کر سندھ میں لائے گئے تھے۔ ایک غلام نے اپنے خیالات یوں بیان کئے۔

"جو عرب جہاز ہمیں جھنگ بار (زنجبار) کی غلام منڈی سے لایا وہ مسقط کی بندرگاہ پر

آ کر لنگر انداز ہوا۔ راستے میں جو غلام شدید بیمار پڑ گئے تھے انہیں اسی حالت میں سمندر میں پھینک دیا گیا۔ ہم بچ جانے والوں کو ایک بڑے سے کوٹ میں لایا گیا جہاں ایک بارعب عرب تاجر ریشمی گدوں پر گاؤ تکئے کا سہارا لئے بیٹھا تھا۔ اس کے حکم پر ہم سب کو ایک قطار میں کھڑا کر دیا گیا اور ہمارا طبی معائنہ کیا گیا۔ ہم میں سے جو موٹے تازے تھے انہیں علیحدہ کر کے ایک دوسرے احاطے میں لے جایا گیا۔ وہاں ان کے ہاتھ اور پیروں کو باندھ کر ایک قطار میں اکڑوں بیٹھا دیا گیا۔ اس کے بعد چند جلاد نما نوکر چاکر آئے جنہوں نے اپنے ہاتھوں میں لوہے کی بڑی بڑی بھاری اور تیز دھار والی بھالے نما سلاخیں پکڑ رکھی تھیں۔ پھر ایک ایک کر کے انہوں نے یہ سلاخیں بیٹھے ہوئے غلاموں کے سروں پر اس قوت سے ماریں کے وہ بدن کے آر پار ہو گئیں۔ اور غلام ان سلاخوں میں سیخ کباب کی طرح پیوست ہو گئے۔"

"احاطے کے ایک کونے میں بڑی بڑی کڑھائیاں آگ پر چڑھے پانی یا تیل سے ابل رہی تھیں۔ غلاموں کو ان ابلتی کڑھائیوں پر کباب کی طرح لٹکا دیا گیا جن کے جسموں سے چربی پگھل پگھل کر ان کڑھائیوں میں گرنے لگی۔ اس انسانی چربی سے عرب تاجر قوت باہ کے لئے ایک مومیہ یا کشتہ تیار کرتے تھے جو سونے کے بھاؤ بکتا تھا اور اس سے وہ بڑا منافع کماتے تھے۔ اور ان بدنصیب غلاموں کے بچے کھچے گوشت کو بعد میں دوسرے غلام قیدیوں کو کھلا دیتے۔ اس طرح انسانی گوشت اور کچھ کھجوریں اور پانی ہماری واحد خوراک تھی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کوئی رحم دل محافظ کسی خاص صورت میں غلام کو بیمار ظاہر کر کے اسے موت کے منہ سے بچا لیتا۔ مگر اس کے فوراً بعد ان زندہ بچ رہنے والے غلاموں کو نہلا۔ دھلا کر۔ اچھے کپڑے اور خوشبو دار تیل لگا کر انہیں غلام منڈی میں لے جا کر بیچ دیا جاتا۔"

غرض یہ کہ نصیبو نام کا ایک غلام اس طرح زندہ بچ کر اور کئی ہاتھوں میں بکتا بکاتا بالآخر آزاد ہو کر ٹنڈو باگو پہنچا اور وہاں آباد ہوا۔ اس نے وہاں شادی کی اور اس کے بال بچے ہوئے۔ محمد صدیق مسافر کے بموجب اس کے پوتے پوتیاں ٹنڈو باگو میں رہتے تھے۔

مسافر نے ایک اور واقعہ بیان کیا جو 1941ء میں ننگھ گوٹھ میں پیش آیا جو ٹنڈو باگو سے پانچ میل کے فاصلہ پر تھا۔ اس گوٹھ میں نصیر نام کا ایک شیدی غلام رہتا تھا۔ نصیر بہت طاقت ور پہلوان تھا اور اگر کسی بات پر بگڑ جاتا تو مالکوں کے لئے اسے قابو میں لانا مشکل ہو جاتا۔ ایک دفعہ جب نصیر کسی بات پر ناراض تھا تو مالک نے کوئی ایک درجن آدمیوں کی مدد

سے اسے سوتے میں پکڑوا کر زنجیروں سے بندھوایا۔ اس کے بعد گوٹھ کے بیچ ایک بڑا سا گڑھا کھود کر اس میں ایک کھمبے کے سہارے نصیر شیدی کو باندھ کر زندہ سنگسار کر دیا۔ روایت کے مطابق اس واقعہ کے ایک سال بعد اس گوٹھ میں ایک وبا پھیل گئی اور لوگ بیمار ہو کر مرنا شروع ہو گئے۔ گوٹھ کے لوگوں نے اس وبا کو نصیر شیدی کی بدعا سمجھا اور اس قدر خوف زدہ ہوئے کہ وہ گوٹھ چھوڑ کر چلے گئے۔ اب وہاں کھنڈرات کے ڈھیر پڑے ہیں جہاں ایک دن ٹینگھ گوٹھ آباد تھا۔ نصیر شیدی کے قتل کے دو سال بعد انگریزوں نے سندھ کو فتح کر لیا اور انگریزوں نے اس کے فورا بعد غلاموں کی تجارت کو غیر قانونی قرار دے دیا۔ اس لئے بھی کہ امریکہ اور دیگر انگریزی کالونیوں میں غلاموں کی بغاوتوں کے بعد یہ پہلے ہی ممنوع قرار پا چکی تھی۔

محمد صدیق مسافر نے ایک شیدی بڑھیا سے سنی ہوئی داستان بھی بیان کی ہے۔

"میں جس رئیس کی غلام تھی اس کو ایک اونٹ سے بہت پیار تھا۔ جب اونٹ کو چارہ دینے کا وقت ہوتا تو میرے لئے مالک کا یہ حکم تھا کہ میں اونٹ کا کوئی آدھ من چارہ سر پر رکھ کر اس کے سامنے کھڑی ہو کر ہی چراؤں۔ اور اونٹ میرے سر پر رکھے ہوئے برتن سے گھاس چرے کیونکہ زمین سے چارہ چرنے میں اونٹ کو گردن نیچے کرنی پڑتی تھی اور اسے تکلیف ہوتی تھی۔ گھنٹوں منوں چارہ سر پر رکھ کر میں اونٹ کو چراتی اور اس دوران میری گردن پر کیا گزرتی اس کا رئیس کو بالکل خیال نہیں تھا۔ غرضیکہ گرمیوں میں چلچلاتی دھوپ ہوتی یا سردیوں کی ٹھنڈی رات ہر روز گھنٹوں مجھے اس اذیت سے گذرنا پڑتا۔"

مسافر کے مطابق اس عورت کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں بھی ٹنڈو باگو کے قرب و جوار میں رہتے تھے۔

گو کہ اس زمانہ میں سندھ کے بڑے بڑے جاگیرداروں۔ وڈیروں۔ رئیسوں اور سرداروں کے گھروں میں شیدی غلام رکھنے کا رواج عام تھا مگر شیدیوں کی اکثریت پیروں۔ سیدوں اور بلوچ رئیسوں کے گھروں میں غلام تھی۔ اور ان غلاموں میں صرف کامدار قسم کے غلام جو اکثر حالات میں باز پالنے۔ تیتر بٹیر رکھنے یا پھر لڑائی کے مرغے اور کتوں اور گھوڑوں کی رکھوالی پر معمور ہوتے نسبتاً بہتر سلوک کے قابل سمجھے جاتے۔ دیگر شیدی غلاموں کی حالت انتہائی ناگفتہ بہ تھی۔ گھریلو غلاموں کے بچے بھی غلام ہی سمجھے جاتے اور انتہائی محنت و مشقت بھری غیر انسانی غلامانہ زندگی کے عیوض انہیں صرف کھانا اور کپڑے

ہی مہیا کیئے جاتے اور ان کے لئے کوئی باقاعدہ تنخواہ کا رواج نہیں تھا۔ گھر سے بھاگ جانے والے غلام کو مجرم سمجھا جاتا اور جب تک اس کے پاس مالک کے ہاتھ کا پروانہ آزادی نہ ہوتا تب تک کسی کو بھی اسے پناہ دینے یا کھانا پینا دینے کی اجازت نہیں تھی۔ کچھ رپورٹوں کے مطابق ہندو مالکوں کا برتاؤ قدرے بہتر تھا۔

چونکہ بیشتر شیدی غلام جنگی قیدی کے طور پر بک کر ہندوستان آئے تھے یا ان کی اولاد تھے اس لئے شیدیوں کو محافظ دستوں کے طور پر فوجی نوکریوں میں رکھنے کا عام رواج تھا۔ اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ بہت سے شیدی غلام ہندوستان کی تاریخ میں بہت نامور سپہ سالار بن کر ابھرے۔ محمود غزنی جو خود ایک ترک غلام الپتگین کا بیٹا تھا اس کی بیشتر جنگی حکمت عملی کا سہرا اس کے شیدی غلام ایاز کے سر تھا۔

التمش کی گھوڑ سوار فوج کا بانکا سپہ سالار یاقوت شیدی بھی غلام تھا جس پر رضیہ سلطانہ فریفتہ ہوئی۔

شیدی ملک کافور گجرات کی مہم میں علاؤ الدین خلجی کے ہاتھ آیا۔ اور پھر جلد ہی اپنی قابلیت کے بل بوتے ترقی کر کے علاؤ الدین خلجی کی فوجوں کا کمانڈر بن گیا۔ علاؤ الدین خلجی ہندوستان کی تاریخ میں جن فتوحات کے لئے مشہور ہے وہ حقیقت میں کافور کی فتوحات تھیں۔ اور بقول کارل مارکس کی کتاب Notes On Indian History علاؤ الدین خلجی نے بذات خود کسی بڑی مہم میں حصہ نہیں لیا۔ کافور شمالی ہندوستان کا پہلا مسلمان سپہ سالار تھا جس نے اپنے برق رفتار حملوں کے ذریعہ جنوبی ہندوستان کو دہلی سے لے کر راس کماری تک دو دفعہ زیر کیا۔

گجرات کاٹھیاواڑ اور مہاراشٹرا کے علاقہ میں شیدی غلاموں نے زنجیرا' اور ساچین' کے نام سے دو خودمختار ریاستیں قائم کیں۔ زنجیرا بمبئی کے نزدیک واقع تھی۔ مغل بادشاہ اکبر کے زمانہ میں ان شیدی غلاموں نے مغل بحری بیڑے کی بنیاد ڈالی اور ان کے نواب امیرالبحر کے طور پر ہندوستان کے مغربی ساحل اور اس کی تجارت کی حفاظت کرتے تھے۔ بعد میں جب مرہٹوں نے مغلوں اور راجپوتوں کو شکست دے کر ان علاقوں پر اپنی اجارہ داری قائم کر لی تو مرہٹے اگلے کوئی ڈیڑھ سو سالہ دور حکومت میں ان شیدی ریاستوں کو فتح کرنے کی کوشش کرتے رہے مگر کامیاب نہ ہو پائے۔ ان چھوٹی چھوٹی دو شیدی ریاستوں نے مرہٹہ قوت کا اتنے طویل عرصہ تک کس طرح دفاع کیا یہ ہندوستان کی فوجی تاریخ کا معمہ ہے۔ 1947ء میں ہندوستان کے بٹوارے کے وقت تک یہ ریاستیں قائم رہیں۔ ان

شیدی ریاستوں کے رشتے ناطے ہندوستان کے دیگر نواب خاندانوں میں ہوتے تھے۔ شاید یہ حقیقت دلچسپی سے خالی نہ ہو کہ مرحوم ذوالفقار علی بھٹو کی ہمشیرہ کی شادی ساچین کے شیدی صاحبزادہ کرنل مصطفیٰ خان کے ساتھ ہوئی تھی۔

شیدی ملک عنبر (1620ء_1550ء) بچپن میں شمبنو کے نام سے بک کر افریقہ سے آیا تھا۔ مگر جوان ہونے پر اپنی قابلیت اور فراست کی وجہ سے احمد نگر کی ریاست کا وزیراعلیٰ بن گیا۔ اس زمانہ میں دہلی کے مغل بادشاہ جنوبی ہندوستان کو زیر کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ ملک عنبر نے مغلوں کی یلغاروں کو روکنے کے لئے احمد نگر۔ گولکنڈا اور بیجاپور کی ریاستوں کا وفاق قائم کیا اور مغل فوجوں کا راستہ روک لیا۔ اکبر بادشاہ سے لے کر شاہ جہاں تک کوئی اگلے چالیس سال تک مغل جنوبی ہندوستان پر یکے بعد دیگرے حملہ آور ہوتے رہے مگر جب تک ملک عنبر شیدی زندہ رہا ان کا یہ خواب شرمندہ تعبر نہ ہو پایا۔ اس تاریخی مزاحمت میں ملک عنبر نے گوریلا جنگ کی حکمت عملی اپنائی۔ اور بعد میں شیوا جی مرہٹہ اور ٹیپو سلطان کی گوریلا جنگیں بھی ملک عنبر کے مکتبہ فکر کی پیداوار تھیں۔

آخرکار عنبر کی وفات کے بعد اورنگ زیب نے جنوبی ہندوستان پر فتح پائی۔ اورنگ زیب نے عنبر کی راجدھانی فتح نگر جو اس کے بیٹے فتح خان کے نام پر بسائی گئی تھی اس کا نام تبدیل کر کے اورنگ آباد رکھ دیا۔

ان کے علاوہ بیشمار شیدیوں نے ہندوستان کی تاریخ میں اہم کردار ادا کیا۔ مگر متعصب اور نسل پرست تاریخ دانوں نے کبھی بھی ان کو خاطر خواہ مقام نہیں دیا اور ان پر گمنامی کی سفیدی پھیرے رکھی۔ جنوبی ہندوستان میں بہمنی ریاست کے "مشہور سپہ سالار خواص خاں اور اخلاص خاں بھی شیدی تھے۔ قیاس ہے کہ ٹیپو سلطان کا بنیادی تعلق بھی شیدی خاندان سے ہی تھا۔"

1843ء میں انگریزوں کی فتح سندھ کے موقع پر ہوش محمد شیدی نے دوبہ کی جنگ میں میر شیر محمد کی پسپا ہوتی ہوئی فوجوں کو سہارا دینے کے لئے چارلس نیپیر کی فوجوں کا راستہ روکا اور ایک شاندار کارنامے کے بعد بہادری سے جان دی۔

ڈیتھ ریلوے سٹیشن سے ایک میل شمال میں سیال گوٹھ کے نزدیک دوبہ کے میدان جنگ میں انگریزوں کے قبرستان کے بل مقابل ہوش محمد شیدی کی ٹوٹی پھوٹی قبر موجود ہے۔ سندھی طرز تعمیر کی اس خوبصورت قبر کو شاندار نمونے پر بنایا گیا تھا۔ پاکستان کے وجود میں آنے کے وقت تک یہ قبر اچھی حالت میں موجود تھی اور لوگ اس پر پھول چڑھانے آتے

تھے۔ مگر پچاس کی دہائی کے بعد شاید کسی سیاسی مصلحت کے تحت سندھ کی تاریخ نے اس قبر کو بھلا دیا۔ گو نعرہ بازی کے طور پر ہوش محمد شیدی کے نام کو خوب اچھالا جاتا ہے مگر اس کی قبر پر آج نہ کوئی درود اور نہ فاتحہ۔ گو ہندوستان کے شیدیوں پر دیوان لکھے جا سکتے ہیں مگر یہ دیوان انسانی گناہ کے اس داغ کو کبھی نہیں دھو سکتے جو ایک انسان نے دوسرے انسان کو جانوروں کی طرح بیچ کر اپنے منہ پر مل لیا ہے۔

جب افریقہ پکارتا ہے۔

غلامی کے دور میں دنیا کے کونے کونے میں بکھر جانے سے پہلے اندرون افریقہ کے بیشتر لوگ قبائلی اور فطرتی زندگی گذارتے تھے۔ دنیا کے دیگر قدیم لوگوں کی طرح قبائلی ناچ گانے ان کی سماجی اور ثقافتی زندگی کو ہم آہنگ اور متوازن رکھتے تھے۔ انسان کو اس کی اصل فطرت میں سماجی جانور بھی کہا جاتا ہے۔ خاص کر تہوار خوشی یا غمی کے موقع پر چاندنی راتوں میں ان کے روح پرور ناچ اور گیت ان کی اجتماعی خوشیوں یا دکھوں کے مظہر ہوتے جسے وہ آپس میں بانٹ لیتے۔ قبائلی زندگی میں ڈھول کو ایک مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔ ڈھول کی تھاپ کے ساتھ جیسے ان کا روحانی بندھن تھا اور جس کی وجد آور آواز پر جب وہ مل کر رقص کرتے تو دشمنیاں چھٹ جاتیں۔ دل دھل جاتے اور پورے قبیلے کے لوگ میل جول اور پیار بھری ایک پراسرار لڑی میں پروئے جاتے۔

غلامی کے دور میں یوں لگتا ہے کہ جیسے افریقہ کے لوگوں کی یہ انسانی حسین لڑی ٹوٹ گئی اور وہ کالے موتیوں کی طرح سمندر پار دور دور تک بکھرتے چلے گئے۔

یوں تو ناچنا اور گانا نہ صرف انسانی بنیادی فطرت کا حصہ ہے بلکہ اس کی روحانی ضرورت بھی ہے۔ مگر مادر وطن سے ہزاروں میل دور غلامی کی ذلت آمیز زندگی میں دھنس جانے کے بعد افریقی شیدیوں کے لئے ان کے ناچ اور گانے بچھڑے ہوئے خاندانوں کی یاد کو تازہ رکھنے۔ آزادی کی امنگ کو زندہ رکھنے اور غلامی کی کٹھن زندگی کو کاٹنے کا واحد سہارا بن کر رہ گئے۔ وہ درد بھری موائیاں گا کر اپنی قبائلی اور خاندانی شناخت کو قائم رکھنے کی کوشش کرتے تاکہ ایک دن بچھڑے ہوئے میت انہیں پہچان سکیں۔ مگر صدیوں پر محیط غلامی کے دور میں شاید ہی کسی غلام کی یہ امید پوری ہوئی ہو۔

سندھ کے شیدیوں نے بھی افریقہ سے بچھڑ جانے کے بعد صدیوں اپنے مخصوص ناچ کو جاری رکھا ہے جسے وہ موگرمان کہتے ہیں۔ موگرمان کا ناچ جہاں ایک طرف آقاؤں کی سخت گیریوں کو لمحہ بھر کے لئے بھلا دینے کا ایک بہانہ رہا ہے تو دوسری طرف اپنے تھکن سے چور ٹوٹتے جسموں اور بھٹکتی روحوں کو جاری اور ساری رکھنے کا ایک ذریعہ بھی۔ یعنی

قبائلی ناچ ان کی ٹوٹی پھوٹی روح کے لئے نفسیاتی مرہم کا کام کرتے۔ سندھ میں جہاں کہیں بھی شیدی یا مکرانی بستی کی صورت میں آباد ہیں وہاں تہواروں، شادی بیاہ اور دیگر موقعوں پر موگرمان ضرور بجاتے ہیں۔

21 ستمبر 1986ء کی رات ٹنڈو باگو میں محمد صدیق مسافر کی برسی منانے کے لئے شیدی جمع ہوئے جس کا اہتمام جماعت کے کارکنوں نے کیا تھا۔ ٹنڈو محمد خاں۔ ماتلی اور میراثی کے شیدی اپنا اپنا موگرمان ساتھ لائے تھے۔ اس زمانہ میں ٹنڈو محمد خاں کا گمبا شیدی موگرمان بجانے کے لئے سندھ بھر میں مشہور تھا۔

موگرمان قدیم طرز کا بیرل نما افریقی ڈھول ہوتا ہے جو کانگو کی طرح زمین پر کھڑا کیا جاتا ہے اور زمین سے کوئی ساڑھے تین فٹ اونچا ہوتا ہے۔ اس کے منہ پر اونٹ کے گردن کی کھال چڑھائی جاتی ہے اور اس کے چو طرف لال رنگ کا گھگھرا نما کپڑا چڑھا دیا جاتا ہے۔ موگرمان کو "دادا" بھی کہتے ہیں شیدی اس ڈھول کا بڑا ادب کرتے ہیں۔ استعمال سے پہلے اگربتی جلا کر تقدس کی خوشبو ہر سو بکھیر دی جاتی ہے۔

جنوبی سندھ میں تیز ساحلی ہواؤں کی وجہ سے ستمبر کی راتیں اکثر خنک ہوتی ہیں۔ ایک بڑے سے احاطے کے بیچ موگرمان رکھ دیا گیا۔ ایک دوسرے کونے میں آگ کا ایک بڑا سا الاؤ جلا دیا گیا تاکہ ٹھنڈی رات میں ڈھول کی کھال کو گرم رکھا جا سکے۔ گمبا شیدی نے رک رک کر ہلکی ہلکی تھاپ کے ساتھ ڈھول بجا کر شروعات کی جس کو سندھ میں "سڈ" کہا جاتا ہے۔ یعنی ناچنے والوں کے لئے میدان میں آ جانے کی پکار۔ موگرمان کی پکار سن کر شیدی ننگے پیر ایک گول دائرے میں ڈھول کے گرد دھیرے دھیرے جھومتے ہوئے ناچنے لگے۔ ان میں جوان بوڑھے بچے سبھی شامل تھے۔ پھر ہلکے ہلکے ٹوٹی پھوٹی سواحلی زبان میں موائی گانے لگے۔ موائی کے بول جس میں سندھی اور اردو کے الفاظ شامل تھے۔ ایک درد بھرا سماں پیدا کرتے تھے۔

"یہ کیا گا رہے ہیں؟" میں نے اپنے دوست فیض محمد شیدی سے پوچھا۔

"یہ گا نہیں رہے ہیں بلکہ رو رہے ہیں!" فیض محمد نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

مگر غور سے سننے پر محسوس ہوا کہ موائی کے بولوں میں ماضی کے درد بھرے واقعات کا ذکر تھا۔ جو ان کو غلام منڈیوں۔ غلامی کی طویل مسافرت اور اپنوں سے بچھڑ جانے کے بعد پیش آئے تھے۔ کبھی کبھی موائی گانے والے دو دھڑوں میں بٹ جاتے اور گاتے میں ایک دوسرے سے سوال کرتے جیسے ایک دوسرے کی پہچان کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ میں

نے میڑانی کے نوے سالہ بوڑھے ڈھولچی چاچا دینا سے چند ایک موائیوں کی تشریح کرنے کو کہا۔ یہ موائیاں گو کے افریقی سواحلی زبان میں تھیں مگر افریقہ سے باہر صدیوں بیت جانے کے بعد اب سواحلی الفاظ اور دوہے خاصی ترمیم اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکے تھے۔ چند بول کچھ یوں تھے۔

"من مانگا منگا نگے
یا مڑو نگے
کف کونڈیا۔ یا نصیب
وٹوبا کوھیری۔ یا قسمت
وا چوڑی کوہن۔ یا قسمت
ماجی ٹیڑھی۔ ٹیڑی۔ اچکوڑی۔ اچکوڑی"

بوڑھے ڈھولچی کے مطابق اس کا مطلب تھا۔

"ہم بچھڑ رہے ہیں
کون جانے پھر کب ملیں
وٹوبا! یہ ہمیں کہاں لے جا رہے ہیں
اووا چوڑی۔ ہماری مدد کر
پانی کے بیچ ہم ساتھ رہیں گے ساتھ مریں گے"

ایک اور موائی یوں تھی

"زبیرا نیچیرا ناکا بوکا۔ نایو گوچا
رولو کویا مڑونگو۔ قیامت موٹو موٹو"

"او بھائی ہم بچھڑ رہے ہیں
مگر مڑونگو کی مدد سے۔ قیامت کے دن پھر ساتھ ہونگے ہمیشہ کے لئے۔"

ایک اور موائی میں گاتے وقت شیدی جوش میں آ کر زور زور سے اردو میں گاتے ہیں۔ "کوٹو میرا ہے۔ کوٹو میرا ہے۔"

"بعد میں پتہ چلا کہ سنٹرل افریقن ریپبلک کے ملک میں کوٹا نام کا ایک دریا ہے جس کے زرخیز کناروں سے شیدیوں کی بڑی تعداد کو غلام بنا کر لایا گیا تھا۔

رات پڑنے پر جیسے جیسے بھرپور چاند روشنی بکھیرتا ہوا آسمان پر اونچا چڑھتا گیا ویسے ویسے گمبا شیدی کی ڈھول پر تھاپ تیز ہوتی گئی اور شیدی وجد اور کیفیت میں مدہوش ہو کر

اتنی لے اور لچک کے ساتھ ناچنے لگے جو دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ پھر گھنٹوں اسی کیفیت میں ناچنے کے بعد کونے میں جلتے ہوئے الاؤ کے ڈھیر سے انگارے اٹھا کر ناچتے شیدیوں کے پیروں کے بیچ میدان میں بکھیر دیے گئے۔ مستی میں ناچتے ہوئے شیدیوں نے پھول کی طرح ہوا میں اٹھتے ہوئے ہلکے اور تھرتھراتے پیروں سے لمحہ بھر میں آگ کو بجھا دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد آگ پھر سے بکھیر دی گئی۔ ناچ تیز سے تیز تر ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ رات ڈھلنے لگی۔ میرے لئے شیدیوں کے ساتھ آگ پر ناچنے کا یہ پہلا موقعہ نہ تھا بلکہ اس کا چسکہ بہت پہلے ہو چکا تھا۔

"کیا تمہیں آگ پر ناچتے ہوئے پیروں کے جلنے کا احساس ہوا؟" ایک غیر شیدی دوست نے پوچھا۔

"بالکل نہیں! بلکہ مجھے یوں لگا جیسے اس عرصہ میری روح بھی مدہوشی میں ناچتے ہوئے شیدیوں کے ساتھ مل کر دور کہیں افریقہ میں چلی گئی تھی۔

اور یہ شاید حقیقت ہے کہ موگرمان کے دوران جب شیدی مستی میں آکر ناچتے ہیں تو ان کی روح پرواز کر کے افریقہ چلی جاتی ہے جہاں سے وہ ایک دن آئے تھے۔ ایک نوجوان شیدی نے میری علامتی منطق سن کر کہا۔

"اور جب انسان یہاں موجود ہی نہ ہو تو پھر جلے کیسے؟"

غرض یہ کہ دنیا میں بکھر جانے کے بعد شیدیوں کے لئے موگرمان کا ناچ افریقہ کی پکار پر نہ صرف لبیک کہنے کی علامت بن گیا بلکہ اکٹھا ہونے اور اتحاد قائم کرنے کا انوکھا ذریعہ بھی۔ غلامی کے ابتدائی دور میں شیدی عورتیں بھی مردوں کے ساتھ مل کر ناچتی تھیں۔ مگر اب بنیاد پرست مسلمان ماحول میں عورتوں کے معاشرتی حقوق چھین لئے گئے۔ بلکہ چند دہائیوں سے موگرمان کا روایتی ناچ جسے راند یعنی کھیل بھی کہتے ہیں مردوں میں بھی گھٹتا جا رہا ہے۔ اور اگر شیدی موگرمان کو قائم رکھنے میں ناکام ہوئے تو یہ روح پرور اور دل آویز افریقی ثقافت اور لوک فن کا المیہ ہو گا جو قدیم زمانے سے ایک حسین ورثے کے طور پر ہم تک پہنچا تھا۔ مگر پھر بھی انسان کے لئے ماضی کی حسین یا درد بھری یادوں کو بھلا دینا آسان نہیں ہوتا۔ افریقہ سے باہر دنیا بھر کے شیدیوں کے لئے موگرمان دکھ اور درد بھری ثقافت کا دوسرا نام ہے۔

حال ہی میں مجھے کینیا کے مشہور ناول نگار نگوگی تھیانگو کے ناول "خون بھری گلاب کی پتیاں" اور "درمیان میں دریا" پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ ان کتابوں میں کچھ ایسے الفاظ اور

اشارے ملے جن سے سندھ کے شیدیوں کا تعلق ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً سواحلی زبان میں گمبا
اس بچے کو کہتے ہیں جس کا سر دھڑ سے بھی بڑا اور بھاری ہو اور اگر گر جائے تو آسانی سے
اٹھ نہ سکے۔ مڑنگو کینیا کے کیکیو اور اوقابی قبائل میں سب سے بڑے دیوتا کو کہا جاتا ہے۔
جو وہاں کی برفیلی پہاڑی چوٹی پر رہتا ہے اور جب لوگ تکلیف میں مبتلا ہو کر پکاریں تو ان
کی مدد کو پہنچتا ہے۔ وا چوڑی کینا کی لوک داستانوں کا بہت نامور سورما گزرا ہے جو لوگوں
میں بہت مقبول ہوا۔ موگو۔ ایک پراسرار ولی تھا جو پہاڑوں سے اتر کر آیا اور گوری نسل
کے لوگوں کے حملہ آور ہونے کے بارے میں پیشن گوئی کی اور لوگوں کو تنبیہہ کی کہ
تیتلیوں کی طرح کے کپڑے پہنے باہر سے ایک قوم آئے گی جو ملک میں تباہی مچائے گی۔ مگر
کسی نے بھی موگو کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔ وہ مایوس اور ناراض ہو کر پہاڑوں میں غائب ہو
گیا۔ خیال ہے کہ موگورمان موگو کی روح کو خوش کرنے کے لئے بجایا جاتا ہے تاکہ لوگ
دکھ اور درد سے نجات پائیں۔

میڑانی کے بوڑھے ڈھولچی چاچا دینا کی سنائی ہوئی موائیوں میں مڑونگو۔ واچوڑی اور موگو
کا حوالہ ملتا ہے۔ اور گمبا ٹنڈو محمد خاں کا مشہور ڈھولچی ہے۔ کیا یہ عین ممکن نہیں کہ چاچا
دینا شیدی کے اجداد کا تعلق غلامی کے دور سے قبل کینیا کے کیکیو قبیلے سے ہی تھا۔

سندھ کا بانکا شہید

ہوش محمد شیدی نے 23 مارچ 1843ء کو دوبہ کی جنگ میں چارلس نیپیر کی فوجوں کے خلاف ایک شاندار معرکہ کے بعد جان دی جس کا اعتراف چارلس نیپیر نے خود اپنی یادداشتوں میں بھی کیا ہے۔ اس مرد مجاہد نے ایک ایسے موقع پر جب کہ میر شیر محمد کی شکست خوردہ فوج تتر بتر ہو رہی تھی اپنی بے مثل بہادری اور اخلاقی معیار کا مظاہرہ کرتے ہوئے جس جرات سے دشمن کا راستہ روک کر سامنا کیا اس کارنامے نے اس کے نام کو ہمیشہ کے لئے امر بنا دیا۔

مگر سندھ کی تاریخ ہوش محمد کے اصل کردار اور کارنامے کے بارے میں پر اسرار طور پر خاموش ہے۔ یہ شاید اس لئے بھی کیا گیا کہ ہوش محمد کی عظمت کو اجاگر کرنے کے لئے ٹالپر دور کے چند ایک گھٹیا اور غدار شہزادوں اور بھگوڑے سپہ سالاروں کو بے نقاب کرنا پڑتا ہے۔ لہٰذا گروہی سیاست کو چمکانے کے لئے اسے جذباتی نعرہ کے طور پر سڑکوں پر تو خوب اچھالا جاتا ہے مگر تاریخ میں اس کی شخصیت کو متنازع بنا کر اصل حقائق کی نہ صرف پردہ پوشی کی گئی ہے بلکہ سرے سے فراموش کر دیا گیا ہے۔

تاریخی حقائق کو دبا دینا یا توڑ مروڑ کر پیش کرنا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہر کوئی حکمران طبقہ اپنے دور کی تاریخ کو محض اپنے اور اپنے خاندان کی مداح سرائی کے طور پر قلم بند کرتا رہا ہے۔ اس لئے اب ہمیں تاریخ کا نئے سرے سے جائزہ لینے کی ضرورت پڑتی ہے تاکہ ڈھکے چھپے نقاط کو کرید کر ہم سچائی اور اصل حقائق کے نزدیک پہنچ سکیں۔ ہوش محمد کے بارے میں بھی غلط بیانیوں اور غلط فہمیوں کو سمجھنے کے لئے ہمیں ایسا ہی کرنا پڑے گا۔

میانی کی جنگ 17 فروری 1843ء کو میانی کے میدان جنگ میں لڑی گئی تھی اور تقریباً چھ گھنٹہ کی معرکہ آرائی کے بعد ختم ہو گئی جس میں انگریزی فوج فتح مند ہوئی۔ ہوش محمد شیدی نے اس جنگ میں حصہ نہیں لیا۔ اس لئے کہ جنگ کے موقع پر اس کے آقا میر صوبدار خان نے اپنے آپ کو حیدر آباد کے قلعہ میں بند کر لیا تھا تاکہ وہ انگریزوں کے خلاف فریق نہ بن سکے اور انگریزوں کے جنگ جیتنے پر مراعات حاصل کر سکے۔

ہوش محمد شیدی نے میر صوبدار کی اس حرکت پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا اور اسے ٹالپور گھرانے کے خلاف غداری تصور کیا تھا۔ اور جب اس نے اس کا برملا اظہار کیا تو میر صوبدار نے ہوش محمد کو برا بھلا کہہ کر قلعہ سے نکل جانے کا حکم دیا۔ مگر جب ہوش محمد قلعہ سے باہر آیا تب تک میانی کی جنگ ہاری جا چکی تھی۔

انگریزوں کے ہاتھوں سندھ فتح ہونے کے وقت حیدر آباد کے قلعہ سے کوئی جنگ نہیں لڑی گئی۔ شاید اس لئے بھی کہ انگریز جدید توپوں سے لیس تھے اور قلعہ میں بیٹھ کر مقابلہ کرنا خودکشی کے مترادف تھا۔ اس لئے اس زمانہ میں حیدر آباد کا قلعہ حکمران میروں کے دفاتر۔ خزانہ اور اہل و عیال کی رہائش گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔

حیدر آباد کے قلعہ میں آخری معرکہ اس وقت ہوا تھا جب میروں نے سندھ کلہوڑہ حکمرانوں سے فتح کیا۔ اور کلہوڑوں کی طرف سے یاقوت شیدی نے قلعہ کا آخری دم تک دفاع کرتے ہوئے بہادری سے جان دی تھی۔ اکثر لوگ یاقوت شیدی اور ہوش محمد شیدی کے معرکوں کو گڈمڈ کر دیتے ہیں حالانکہ ان کے درمیان کم سے کم ساٹھ سال کا عرصہ حائل ہے۔

ٹالپور میروں کے زمانہ میں سندھ تین چار نیم خودمختار جاگیروں میں تقسیم تھا۔ جن کا ڈھیلا ڈھالا وفاق تھا مگر ان کے درمیان نہ کوئی مرکزی فوج کا انتظام تھا اور نہ ہی مرکزی انتظامیہ کا کوئی بندوبست تھا۔ جاگیریں قبائلی طرز پر چلائی جاتی تھیں اور ان میں آپس کی حسد۔ رقابتوں اور لڑائی جھگڑوں کی فضاء قائم تھی۔ عیاشی اور شکار ان کے محبوب مشاغل تھے۔

ہوش محمد شیدی نہ ہی تو کوئی جرنل تھا اور نہ ہی باقاعدہ فوج کا سپاہی۔ بلکہ وہ میر فتح علی خاں کا جس نے 1782ء میں سندھ کلہوڑوں سے فتح کیا تھا خانہ زاد غلام تھا۔ ہوش محمد شیدی میر فتح علی خاں کے بیٹے میر صوبدار خاں کا ہم عمر تھا۔ وہ ایک ہی گھر میں پیدا ہوئے اور پل کر جوان ہوئے تھے اور ان میں گہری دوستی کا رشتہ بھی قائم تھا۔

میر فتح علی کی وفات کے وقت صوبدار خاں بہت کم عمر تھا اس لئے تخت پر اس کی بجائے اس کے چچا میر نصیر خاں کو بٹھا دیا گیا۔ جب صوبدار خاں جوان ہوا تو اسے اس بات پر ملال رہا اور وہ دل ہی دل میں اس کا بدلہ لینے اور تخت حاصل کرنے کے خواب دیکھتا رہا۔

صوبدار خاں کو بدلہ لینے کا یہ موقع اس وقت میسر آیا جب چارلس نیپر نے 1843ء

میں سندھ فتح کرنے کی ٹھانی۔ صوبدار نے پس پردہ انگریزوں کی ہر طرح سے مدد کی اور میانی کی جنگ میں اپنے آپ کو حیدر آباد میں قلعہ بند کر لیا۔ ایسے حالات میں ہوش محمد شیدی نے غلام ہونے کے باوجود صوبدار کا ساتھ نہ دے کر اعلیٰ اخلاقی معیار کا مظاہرہ کیا۔ جس کے بعد صوبدار نے ہوش محمد کو قلعہ سے نکال دیا اور انگریزوں کی فتح پر تخت حاصل کرنے کے بعد اسے قرار واقعی سزا دینے کی دھمکی بھی دی۔

اس واقعہ کے چار دن بعد یعنی 21 فروری 1843ء کو فاتح انگریز فوجیں صوبدار کے دروازہ کھولنے پر حیدر آباد کے قلعہ میں داخل ہوئیں۔ جنگ ہار جانے کے بعد بیشتر میر حکمران اور اہلکار پہلے ہی گرفتار کیے جا چکے تھے۔ قلعہ میں داخل ہوتے ہی انگریزوں نے صوبدار کو اور اس کے ساتھ میر محمود خاں کو بھی گرفتار کر لیا۔ اس کے بعد انگریز افسروں نے نہ صرف میروں کا خزانہ جو قلعہ میں تھا جی بھر کر لوٹا بلکہ ان کے شاہی محلات کی بے حرمتی کرتے ہوئے ان کے اہل و عیال کا اثاثہ بھی لوٹ لیا۔

ہوش محمد شیدی کو اپنے آقا کے گھرانے کی انگریزوں کے ہاتھوں بے عزتی پر بہت ملال ہوا۔ اس نے بچے کچھے شیدی ساتھیوں کو اکٹھا کیا اور انگریزوں سے بدلہ لینے کی ٹھان کر میرپور خاص چلا گیا جو میر شیر محمد کی جاگیر تھی۔ ہوش محمد کے اصرار پر میر شیر محمد نے 15 مارچ 1843ء کو ایک بڑے لشکر کے ساتھ حیدر آباد کی طرف کوچ کیا تاکہ انگریزوں سے ٹکر لے سکے۔ مگر چارلس نیپیر نے غدار سرداروں اور سپہ سالاروں کی مدد سے میر شیر محمد کی نقل و حرکت اور اصل نیت پر کڑی نظر رکھی ہوئی تھی۔ 23 مارچ کو چارلس نیپئر نے پھلیلی کے پار دوبہ کے مقام پر میر شیر مہد کی پیش قدمی روک دی۔ اس وقت نیپئر کی فوج میں تیسری بمبئی کیولری۔ ایک سکواڈرن پونا ہارس۔ بانسویں پیادہ رجمنٹ۔ اور بارہویں رجمنٹ (NI) بھی شامل تھیں اور اس کی فوج کی کل تعداد پانچ ہزار تھی۔ اسی دن سویرے دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا اور دوپہر کے وقت معرکہ پڑا۔ دوبدو جنگ کے بعد شام تک نیپیر کی بہتر مسلح اور تربیت یافتہ کیولری فوج بلوچ فوجوں کا دفاع توڑ کر عقب میں پہنچنے میں کامیاب ہو گئی۔ نتیجہ کے طور پر میر شیر محمد کی فوج میں بھگدڑ مچ گئی اور وہ پیچھے ہٹنے لگی۔

ان حالات میں جب میر شیر محمد کی فوج میدان چھوڑ رہی تھی تو ہوش محمد شیدی نے بگڑتے ہوئے حالات کا جائزہ لیا اور اپنی خداداد ذہانت اور شجاعت کا مظاہرہ کرتے ہوئے میر شیر محمد کو رائے دی کہ وہ اپنی فوج کو پیچھے نکال لے جائے اور پھر سے جمع کرے تاکہ اگلی صبح پھر سے حملہ آور ہو سکے۔ تب تک یعنی اس رات ہوش محمد شیدی نے اپنے منتخب

ساتھیوں کے ساتھ انگریز فوج کو دوبہ کے مغربی کنارے پر روکے رکھنے کی ذمہ داری خود اپنے کندھوں پر ڈال لی۔ وہ ایک ایک کر کے رات کے شب خون میں شہید ہوتے گئے مگر پیچھے ہٹنے کا نام نہیں لیا۔ اسی تاریخ ساز رات کو اس نے نعرہ لگایا کہ "سر ڈلیسوں پر سندھ نہ ڈلیسوں" جو اب بھی لوگوں میں مقبول ہے۔ وہ رات بھر اس امید میں ڈٹے رہے کہ صبح سویرے میر شیر محمد کی فوج لوٹ آئے گی اور ان کی جگہ لے لے گی۔ مگر افسوس کہ دوسری صبح میر شیر محمد کی فوج مورچے پر نہ پہنچی۔ اور اس طرح یہ مٹھی بھر شیدی ایک ایک کر کے شہید ہوئے اور ان کی شہادت کے ساتھ پورا سندھ انگریزوں کا غلام ہو گیا۔ ایک روایت کے مطابق ان شیدیوں نے ایک زنجیر کے ذریعہ اپنے کو ایک دوسرے کے ساتھ باندھ لیا تھا تاکہ کوئی بھی دل چھوڑ کر بھاگ نہ سکے۔

سرکاری تاریخ نے خواہ کتنی ہی ڈنڈی کیوں نہ ماری ہو پر لوگوں نے لوک داستانوں کے ذریعہ ہوش محمد شیدی کے کارنامے اور اس کے نام کو زندہ رکھا ہے۔ دوبہ کے مشرقی کنارے پر اسی جگہ پر جہاں وہ شہید ہوا کسی نے سندھی طرز کی ایک خوبصورت قبر بنائی جس پر جال کا ایک درخت آج تک سایہ فگن ہے۔ کیونکہ اس زمانہ کے رواج کے مطابق شہیدوں کو میدان جنگ ہی میں دفن کیا جاتا تھا۔ ہوش محمد کی قبر کے مدمقابل دوبہ کے مغربی کنارے پر انگریزوں کا قبرستان ہے جس میں انگریزوں کے فتح کا مینار۔ زنجیریں اور توپیں اسی طرح زمانہ حال تک نصب تھیں جس طرح حیدر آباد کے قلعہ میں ملتی ہیں۔

ہوش محمد کی قبر اور انگریزوں کی ڈیوڑھی اپنے توپ و تفنگ کے ساتھ تقسیم ہند تک اچھی حالت میں موجود تھیں۔ اور جہاں انگریز اپنے مرحومین کو ثواب پہنچانے آتے وہاں کچھ لوگ ہوش محمد کی قبر پر فاتحہ پڑھنے بھی آتے تھے۔ مگر آزادی کے بعد ہوش محمد کی قبر کو دانستہ یا نادانستہ طور پر بھلا دیا گیا۔

اسی دوران ایک سیاسی حلقے نے یہ پرچار کرنا شروع کیا کہ ہوش محمد کی قبر قلعہ میں ہے۔ اور اس کے بعد ہوش محمد کی قبر کے ساتھ ساتھ ہوش محمد کا کارنامہ بھی پراسراریت کا شکار ہوتا گیا۔ ایک نام نہاد دانشور نے یہاں تک کہہ دیا کہ وہ رومانیہ کا رہنے والا تھا۔ دوسرے نے کہا کہ وہ فرانسیسی فوج کا سپاہی تھا۔ گویا کہ جتنے منہ اتنی باتیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ شیدیوں کی تاریخ کا مشرقی یورپ کے ملک رومانیہ یا مغربی یورپ کے فرانس کے ساتھ دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ اس منطق کی جو بھی وجہ ہو اور میں اس قسم کی جاہلانہ بحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔ مگر ایک بات صاف ہے کہ انگریز نے اپنے کل تین سو سالہ دور

حکومت میں کبھی بھی اپنے خلاف لڑنے والے حریت پسندوں کی قبریں نہیں بنائیں۔ بلکہ وہ تو ایسی قبروں کے نام و نشان تک نہیں چھوڑتے تھے جن کے گرد عوام کو اکٹھا ہونے کا ڈر ہوتا۔ مثلاً ٹیپو سلطان۔ سراج الدولہ' جھانسی کی رانی۔ نانا صاحب۔ حضرت محل اور پیر صبغت اللہ اول جو انگریزوں کے خلاف صف اول کے سرفروش تھے انگریزوں نے ان کی قبروں کا نشان تک نہیں چھوڑا۔ تو پھر ہوش محمد کو قلعہ میں کیوں جگہ ملتی جو اب ان کی اپنی رہائش گاہ اور سرکاری دفتری جگہ تھی۔ کیا ہوش محمد غدار تھا۔ "اور اگر غدار کو بھی یہ درجہ دینا تھا تو پھر منطقی طور پر میر صوبدار کی قبر کو قلعہ میں ہونا چاہئے تھا۔ ایسے بہت سے سوال ہیں جن کا جواب تاریخ خود دے گی۔ مگر اس زمانہ کے رواج کے مطابق شہیدوں کی قبریں میدان جنگ میں بنائی جاتی تھیں۔ یا اس جگہ پر جہاں وہ شہید ہوتے۔ اس طرح میانی کے شہیدوں اور انگریزوں کی قبریں میانی میں واقعہ ہیں۔ دوبہ کی جنگ میں شہید ہونے والوں کی قبریں انگریزوں سمیت دوبہ کے میدان میں ہیں۔ جب کہ حیدر آباد کے قلعہ میں ان انگریزوں کی قبریں ہیں جو فتح سندھ کے بعد قلعہ میں رہائش کے دوران فوت ہوئے یا پھر وہ جو انگریزی حفاظتی دستے کے بارود خانے میں آگ لگ جانے سے مر گئے تھے۔

ڈ۔لتھ ریلوے سٹیشن سے ایک میل شمال میں سیال گوٹھ کے ساتھ دوبہ کا میدان جنگ اور قبرستان ہے جہاں ہوش محمد شیدی کی قبر ٹوٹ پھوٹ کر خستہ حالت میں اب بھی کھڑی ہے۔ اور کئی دہائیوں سے اس کا کوئی وارث نہیں ہے۔ اور نہ ہی کوئی اس کی عظیم روح کو فاتحہ پڑھ کر ثواب پہنچانے والا۔ سیال لوگوں نے کوئی ایک صدی تک اس قبر کی حفاظت کی ہے۔ ایک 80 سالہ بوڑھے سیال بزرگ نے مجھے 1978ء میں بتلایا تھا کہ اس قبر پر ہوش محمد شیدی کے نام کتبہ بھی لگا تھا۔ پچاس کی دہائی میں سیلابوں سے اس قبر کو نقصان پہنچا تھا اور اس کے چند سال بعد بقول سیال بزرگ کے چند نام نہاد دانشور آئے اور اس قبر کا کتبہ اتار کر لے گئے۔ اور اس کے فوری بعد یہ پروپیگنڈا شروع ہوا کہ ہوش محمد کی قبر قلعہ میں ہے۔ کیا کوئی زندہ قوم اپنے جیالے سپوت کی اس سے بڑی ہتک کی مرتکب ہو سکتی ہے۔؟

مسافر شیدی

محمد صدیق مسافر شیدی نے اس صدی کی دوسری اور تیسری دہائی میں سندھی ادب۔ تعلیم۔ شاعری۔ صحافت۔ عمرانیات اور موسیقی کے فروغ کے لئے انتھک کام کر کے اپنے لئے انوکھا نام پیدا کیا۔ وہ ساحلی سندھ میں بدین ضلع کے شہر ٹنڈو باگو کے ایک غلام شیدی گھرانے میں پہلی اپریل 1879ء میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے سندھ کے اس اندھیارے کونے میں علم و تعلیم کی ایک ایسی لو جلائی جو دیر تک یہاں کے لوگوں کے دل گرماتی رہی ہے۔

محمد صدیق مسافر کا والد بچپن میں چھ سات سال کی عمر میں زنجبار کے بدنام زمانہ غلاموں کی منڈی سے بک کر مسقط پہنچا جہاں شیخ حسن نام کے ایک عرب نے اسے خریدا اور بعد میں بلاول کے نام سے اسے سندھ میں بیچ دیا۔ معصوم بلاول بکتا بکاتا ٹھٹھہ پہنچا جہاں غلام علی نام کے ایک سنگ تراش نے اسے خرید لیا۔

اس زمانہ میں میرولیہ خاں نام کا ایک بڑا رئیس ٹنڈو باگو کے مقام پر اپنے لئے ایک بڑا کوٹ تعمیر کروا رہا تھا۔ میرولیہ خاں نے غلام علی سنگ تراش کو اس سلسلہ میں ٹنڈو باگو بلوا بھیجا اور بلاول بھی اس کے ساتھ ٹنڈو باگو ہی آ گیا۔

"کلیات مسافر" میں اپنے والد کی سرگزشت بیان کرتے ہوئے مسافر نے لکھا ہے کہ ایک دن سنگ تراش غلام علی نے بازار سے مچھلی خرید کر پکوانے کے لئے اپنے گھر بھیجی۔ اس کی بیوی نے بلاول سے کہا کہ وہ نزدیک نہر پر جا کر مچھلی کو صاف کر لائے۔ جب بلاول نہر کے کنارے بیٹھا مچھلی دھو رہا تھا تو اچانک مچھلی اس کے ننھے ہاتھوں سے پھسل کر پانی میں بہہ گئی۔ کھانے کے وقت جب غلام علی گھر آیا تو دستر خوان پر مچھلی نہ پا کر اپنی بیوی پر برس پڑا۔ جب بیوی نے بلاول کے ہاتھوں سے مچھلی کے نہر میں پھسل جانے کا واقعہ سنایا تو اس نے طیش میں آ کر پہلے تو بلاول کی خوب گت بنائی اور پھر بالوں سے گھسیٹتا ہوا بازار کی طرف چل پڑا۔ راستہ میں اسے سید مخدوم حر علی نامی ایک شخص سامنے سے آتا ہوا ملا۔ جس نے غلام علی سے پوچھا کہ وہ اس بچے کو اس طرح مارتے پیٹتے کہاں لے جا رہا ہے؟۔ اور جب اسے پتہ چلا کہ وہ اس بچے کو بیچنے کے لئے لے جا رہا ہے تو مخدوم حر علی نے

بلاول کو خرید لیا۔ بلاول جس کا نیا نام گلاب خاں رکھا گیا بڑی وفا شعاری کے ساتھ اس گھر کی خدمت کرتے ہوئے اسی گھرانے میں پل کر جوان ہوا۔ غلامی کے خاتمے پر آزاد ہو کر ایک شیدی خاتون سے شادی کر لی۔

محمد صدیق مسافر گلاب خان کے گھر انتہائی غربت۔ غلامی اور بیمار ماحول میں پیدا ہونے کے باوجود بڑا ہو کر پرائمری سکول ٹیچر بنا اور پھر 1901ء میں حیدر آباد ٹریننگ اسکول میں استاد بن گیا۔ یہی ٹریننگ سکول بعد میں ٹریننگ کالج بن گیا جہاں محمد صدیق مسافر نے 1921ء تک درس و تدریس کے ساتھ ساتھ تحقیقی خدمات انجام دیں۔ اس دوران انہوں نے تعلیمی نصاب کے لئے کتابیں لکھیں جو سندھ کے علاوہ بمبئی پریزیڈنسی میں بھی پڑھائی جاتی تھی۔ 1919ء میں محمد صدیق مسافر نے ٹنڈو باگو کے مقام پر ایک پرائمری اسکول کی بنیاد رکھی جو وقت گذرنے کے ساتھ کراچی کے سندھ مدرسہ اور نوشہرو فیروز کے بعد سندھ کا تیسرا مسلم ہائی اسکول قرار پایا۔

مسافر نے اس زمانے میں چند ایک اخباروں کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیئے۔ وہ 1901ء میں ''اخبار تعلیم'' کا مدیر تھا۔ 1919ء میں ہندوؤں کے ایک اخبار ''برھمو سماج'' کی ادارت کی۔ یہ دونوں اخبارات حیدر آباد سے نکلتے تھے۔ مسافر نے 1935ء میں ٹنڈو باگو سے ''لاڑ گزیٹ'' نکالا اور پھر کوٹری کے ایک شیدی دوست علی کی شراکت میں ''الحبش اخبار'' کی بنیاد رکھی جو کوٹری سے نکلتا تھا۔

محمد صدیق مسافر سندھی ادب کا نامور شاعر بھی تھا اور اس نے سندھی ادب اور زبان کی ترقی کے لئے قابل قدر خدمات انجام دیں۔ اس کی شاعری۔ مسدس۔ کلیات۔ رباعیات اور غزلیات پر مشتمل ہے۔ اس کی شاعری کا ایک مجموعہ کلیات مسافر کے نام سے آر۔ ایچ۔ احمد اینڈ برادرس حیدر آباد نے شائع کیا تھا۔

اسی طرح سندھی نثر کے فروغ میں مسافر کا نام پیش پیش رہے گا۔ مسافر کے دو ناول ''مہروز بانو' اور ممتاز دم ساز'' اپنے زمانے کے مقبول ترین کلاسیک ناول تھے جو سندھی ادب کے نصاب کے طور پر پڑھائے جاتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ مسافر نے سندھی ادب کی تاریخ کے نام سے بھی ایک کتاب مرتب کی تھی جو بعد میں کسی نے اپنے نام سے شائع کروا دی۔ محمد صدیق مسافر نے افریقہ سے غلامی کی تجارت کے بارے میں بھی خاطر خواہ مواد چھوڑا ہے۔ اس سلسلہ میں مسافر کی ایک کتاب ''غلامی اور آزادی کے عبرت ناک نظارے'' پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے جس میں امریکہ کے شیدیوں کی جدوجہد آزادی کے علاوہ

سندھ کے غلام شیدیوں کی حالت پر قیمتی تحقیقی مواد ملتا ہے۔ حقیقت میں افریقہ کے مشرقی ساحل سے غلامی کی تجارت کے بارے میں یہ واحد عبارت نظر آتی ہے۔ جیسا کہ مسافر کے ناولوں کے ناموں سے ظاہر ہے وہ تعلیم نسواں کا حامی تھا۔ ایک ایسے زمانہ میں جب کہ سندھ کے مردوں میں بھی تعلیم کا سخت فقدان تھا مسافر نے عورتوں کی تعلیم کے بارے میں نہ صرف بھرپور جدوجہد کی بلکہ ٹنڈو باگو میں لڑکیوں کے لئے ایک پرائمری سکول کی بنیاد رکھی جو آج کل گرلز ہائی سکول ہے۔ مسافر نے ایک ناول "حیاتی جادور" کے نام سے لکھا یعنی زندگی کے مراحل جس میں عورت کے سوال پر دلچسپ بحث ہے۔ اس ناول میں عورت کی معاشرتی قید۔ مردوں کے ہاتھ غلامی اور ان کے خلاف مردانہ تعصب کے بارے میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ مسافر نے "سنجان زالیوں" یعنی ہوش مند عورتیں کے نام سے چند ایک مشہور اور نامور خواتین کی سوانح عمریاں بھی لکھی ہیں۔

محمد صدیق مسافر سادہ لوح۔ سادھو منش۔ نرم دل اور بے ضرر حبشی تھا۔ وفا۔ ایمانداری اور عجز و انکساری تو گویا اس کی گھٹی میں تھی۔ مسافر نے پیدائش سے لے کر آخری وقت تک زندگی انتہائی مفلسی میں بسر کی۔ دو وقت کھانے کے لئے وہ اکثر اپنے ادبی مسودے چند ٹکوں کے عوض بیچ دیتا۔ اس طرح اس زمانے کے بہت سے لوگ مسافر سے قلمی مسودے خرید کر ادیبوں اور دانشوروں کی صفوں میں شامل ہوئے۔ جب زمانے کی سنگدلی۔ زندگی کی سختیاں اور بھوک و افلاس اس کے حساس دل کو مسوسنے لگتے تو وہ اپنے کٹیا نما کمرے میں بند ہو کر موگورمان بجانا شروع کر دیتا۔ کبھی کبھی رات ڈھلے جب مسافر کے بھاری ہاتھوں کی ڈھول پر تھاپ سنائی دیتی تو شیدی بستی کے لوگوں کو نیند کی مدہوشی میں لوری کا احساس ہوتا۔ "راگ ودیا" کے نام سے مسافر نے برصغیر کی موسیقی پر بھی ایک کتاب لکھی جس میں مشہور و مقبول کلاسیکی سروں کی تشریح کی گئی تھی۔ مگر اس کی طباعت سے پہلے ہی مسافر اپنا سفر مکمل کر گیا اور اس کی لکھی ہوئی خوبصورت کتابت میں یہ مسودہ اب بھی موجود ہے۔

مگر آج کل کے تعفن زدہ اور ضمیر فروش سیاسی ماحول میں لوگ قبروں سے مردے اکھاڑنے کا ہنگامہ تو پل بھر میں کھڑا کر سکتے ہیں۔ مگر محمد صدیق مسافر جیسے عظیم انسان کے بارے میں ستائش کا ایک لفظ لکھنے کے اہل نہیں ہیں۔ ماتلی کے ایک ہونہار شیدی عبدالباری قنبرانی نے مسافر کی ادبی تخلیقات پر ایک طویل تحقیقی مقدمہ تیار کیا تھا۔ مگر افسوس عبدالباری شیدی جو خود بھی مسافر ہی کے ذہن کی تخلیق تھا اس کتاب کی طباعت

سے پہلے ہی اس دنیا سے کوچ کر گیا۔ اور اب شاید یہ مقدمہ کسی تحقیقی ادارے کی نظر ہو چکا ہے اور اس کا بھی وہی حشر ہو گا جو مسافر کے لکھے ہوئے مسودوں' سندھی ادب کی تاریخ اور راگ ودیا کا ہوا جو نام نہاد ادیبوں نے اپنے نام سے چھپوا ڈالے۔

زندگی ایک طویل اور درد بھرا سفر ہے۔ افریقہ کے جنگلوں سے لے کر سندھ کے صحراؤں تک کبھی ختم نہ ہونے والا اندوہ ناک تسلسل۔ اور مسافر سے زیادہ اس سفر سے کون واقف تھا۔

افریقی دلہن

شاہدہ ایک شیدی لڑکی ہے اور اس کا تعلق ضلع بدین کے ساحلی سندھ سے ہے اس کے اجداد کو زنجیروں میں جکڑ کر افریقہ سے لایا گیا تھا اور پھر صدیوں کی غلامی کے لئے سندھ میں بیچ دیا گیا۔ نسل پرستی۔ قوم پرستی یا نو آبادیاتی نظام جیسے عام فہم الفاظ اس بھیانک۔ غیر انسانی اور شیطانی تاریخی جرم کو بیان کرنے کے لئے ناکافی ہیں۔

شاہدہ ٹنڈو باگو کے نزدیک پہاڑ مری نام کی ایک چھوٹی سی گوٹھ میں پیدا ہوئی اور وہیں ابتدائی تعلیم بھی حاصل کی۔ اس کی ماں بھاگی اسکول ٹیچر تھی اور اس کا والد عبدالباری شیدی وکیل تھا۔ وہ ماتلی کے رہنے والے تھے اور محمد صدیق مسافر کے ہونہار شاگردوں میں سے تھے۔

شاہدہ نے ماتلی سے میٹرک اور ٹنڈو محمد خاں سے ایف۔ ایس۔ سی پاس کرنے کے بعد سندھ یونیورسٹی سے بی۔ ایس۔ سی کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے ہم جماعتوں کے مطابق وہ بہت لائق اور دلیر طالب علم تھی۔

گریجویشن کرنے کے بعد شاہدہ نے بغدادی کراچی میں سکول کے بچوں کو پڑھانا شروع کر دیا۔ اور پھر ایک دن اچانک بلیو لائن کوچ سروس میں بکنگ مینجر کی نوکری حاصل کر کے اپنے قبیلے کو حیران کر دیا۔ اور اندرون سندھ کے دیہات سے آئی ہوئی لڑکی کے لئے یہ کوئی معمولی قدم نہ تھا اور نہ ہی دیہات کا جاگیردارانہ معاشرہ اسے اتنی آسانی سے معاف کرنے کو تیار تھا۔ قدامت پسند رشتہ داروں کے ہاتھوں سے اسے خاصی پریشانی اور دباؤ کا سامنا کرنا پڑا۔ انہوں نے یہ بھی کوشش کی کہ دیہات میں اس کو بیاہ دیا جائے۔ مگر شاہدہ پیچھے مڑ کر دیکھنے کی عادی نہیں تھی۔ اس نے ایک اور قدم آگے بڑھایا اور گھانا کے ایک افریقی طالب علم ابراہیم سار پونگ کے ساتھ شادی کر کے اپنے غلامانہ ماضی کی کشتیاں ہمیشہ کے لئے جلا دیں۔

اسی زمانے میں مجھے ابراہیم سار پونگ سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ وہ بہت ہی حسین نوجوان تھا۔ اسے ایک نظر دیکھنے سے اس پر سیاہ سنگ مرمر کے بنے مجسمے کا واہمہ ہوتا تھا۔ اس کی

چمڑی کالی ریشم کی طرح چمکدار اور خدوخال جاذب تھے۔ نرم گفتار اور دھیرج مزاج جب وہ ہلکے ہلکے قدم رکھ کر چلتا تو یوں لگتا جیسے دھرتی پر کم سے کم بوجھ بننے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کے علاوہ کراچی شہر کا بہترین فٹ بال کا کھلاڑی اور کراچی کی چیمپئن ٹیم کا سینٹر فارورڈ تھا۔ گھانا میں اکرہ کے گاء قبیلے میں پیدا ہونے والا یہ نوجوان اعلیٰ تعلیم کے لئے 1979ء میں پاکستان آیا اور آج کل بنگال میں پیشہ وارانہ فٹ بال کھیلنے میں مشغول ہے۔

"شاہدہ" میں نے پوچھا "اس خطہ میں شاید تم پہلی شیدی لڑکی ہو جس نے صدیوں کے بعد اپنی افریقی جڑوں کے ساتھ پھر سے رشتہ قائم کرنے کی ہمت کی ہے۔ تمہیں اب کیا محسوس ہوتا ہے؟"

شاہدہ نے بتلایا کہ۔ "میں اس شادی سے بہت خوش اور مطمئن ہوں۔ اپنی توقعات سے کہیں زیادہ۔ جب میں بلیو لائن ٹرانسپورٹ سروس میں صبح 8 بجے سے لے کر شام 4 بجے تک کام کرتی تھی تو ابراہیم گھر سنبھالتا۔ کیونکہ اس کی فٹ بال کی پریکٹس اور میچ وغیرہ شام کو ہوتے تھے۔ وہ میرے لئے کھانا پکاتا۔ کپڑے دھوتا۔ گھر کو صاف ستھرا کر کے میرے آنے کا انتظار کرتا۔ مجھے بتلاؤ کہ کونسا سندھی نوجوان اپنی شیدی بیوی کے لئے عزت و احترام کے ساتھ یہ سب کچھ کر سکتا ہے؟" وہ کچھ دیر رک کر کہنے لگی۔

"وہ مجھ سے پوچھے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کرتا۔ حقیقت میں وہ چاہتا ہے کہ اس کے بارے میں سب فیصلے میں کروں۔ وہ بہت ہی اچھا انسان ہے۔"

شاہدہ نے سندھی لہجے میں زور دے کر کہا۔

"وہ مجھے اپنے برابر سمجھتا ہے اور میرا رویہ بھی اس کے لئے اسی قسم کا ہے۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ اچھے دوستوں کی طرح رہتے ہیں۔ اگلے ماہ ہم گھانا جا رہے ہیں۔ اس کا احساس میرے دل میں ایک انوکھی مگر خوش کن سی ہلچل پیدا کئے ہوئے ہے۔ پہلی ملاقات کے بعد میں نے کبھی ابراہیم کو غیر ملکی نہیں سمجھا۔ مجھے تو یوں لگا جیسے وہ ہم میں سے ہی تھا۔ اور اب گھانا جاتے وقت مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں اپنے میت مائیتوں کو ملنے اپنے ہی گھر جا رہی ہوں۔" شاہدہ نے جب بات ختم کی تو اس کی آنکھوں میں ایک دور جھانکنے والی چمک سی تھی۔

جب میں نے ابراہیم سے پوچھا کہ ان کی ملاقات کیسے ہوئی تو اس نے اپنے مخصوص افریقی انداز میں بتلایا۔

"حقیقت میں جب میں کراچی آیا تو شہر میں اتنے سارے افریقی چہرے دیکھ کر دنگ رہ

گیا۔ مگر میرے پوچھنے پر وہ اپنے آپ کو بلوچی یا مکرانی بتلاتے اور اپنی افریقی جڑوں کے بارے میں سوال کرنے پر یا تو بے اعتنائی سے ٹال جاتے اور یا پھر اس بارے میں بالکل بے خبر ہوتے۔ مگر اندرون سندھ کے شیدیوں کے بارے میں مجھے کچھ علم نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ میں پاکستان میں ایک بلوچ لڑکی سے ہم کلام ہونے یا راہ و رسم پیدا کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ مگر ایک دن میں نے شاہدہ کو سامنے سے آتا دیکھا اور اسے افریقی طالب علم سمجھ کر اس کی خیریت دریافت کی۔ اور جب شاہدہ نے انگریزی بولتے ہوئے مجھے بتلایا کہ وہ افریقی نہیں ہے اور سندھ کے شیدی قبیلے سے تعلق رکھتی ہے اور یہ کہ اسے احساس ہے کہ ایک دن اس کے شیدی لوگ افریقہ ہی سے آئے تھے تو میں حیران رہ گیا۔"

"اور پھر تم دل کھو بیٹھے نا؟" میرے پوچھنے پر ہلکی سی شرمیلی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

"مگر تم گاء بولتے ہو اور وہ سندھی بولتی ہے تو پھر تمہیں ایک دوسرے کو سمجھنے میں کوئی دشواری تو پیش نہیں آتی؟" میں نے پوچھا۔

"بالکل نہیں۔" ابراہیم نے کہا۔ "میں ٹوٹی پھوٹی اردو بول لیتا ہوں اور شاہدہ تھوڑی بہت انگریزی بول لیتی ہے۔ تو جب میری اردو ختم ہو جاتی ہے تو شاہدہ انگریزی بولنا شروع کر دیتی ہے اور جب شاہدہ کی انگریزی پوری ہو جاتی ہے تو میں اردو بولنا شروع کر دیتا ہوں۔ ہمیں اس بارے میں کبھی دقت کا احساس نہیں ہوا۔" ابراہیم نے بتلایا۔

"اور ہو بھی کیسے۔ پریم کی زبان تو نیاری ہوتی ہے جو دل کی گہرائیوں سے نکلتی ہے اور جو چھوٹے چھوٹے علاقائی اور لسانی دائروں سے بالاتر ہو کر بین الاقوامی حدیں چھو جاتی ہے۔ اور وہ زبان تو تم فرفر بولتے ہو گے؟" میں نے ازراہ مذاق کہا اور وہ دونوں ہنسنے لگے۔

"شاہدہ؟" میں نے اس سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔ "تمہارے خیالات پر کس کا اثر زیادہ ہے۔ ماں کا یا باپ کا؟"

"میرا خیال ہے میری ماں کا اثر مجھ پر زیادہ ہے۔" اس نے سنجیدگی کے ساتھ سوچتے ہوئے کہا۔ "میری ماں نے بیشتر ماؤں کی طرح بہت دکھ دیکھے ہیں۔ اور بچوں پر اس کا اثر پڑنا لازمی بات ہے۔ جب میں لڑکے اور لڑکیوں کے مخلوط سکول میں داخل ہوئی تو میری ماں نے مجھے سمجھایا کہ جب میں گھر سے باہر قدم رکھوں تو اپنے آپ کو لڑکا سمجھوں نہ کہ ایک کمزور لڑکی۔ ورنہ یہ جاگیردارانہ اقدار کا گھٹیا معاشرہ قدم قدم پر میرے پیر روکے گا۔ اور میں نے ایسا ہی کیا۔ مگر میں نے اپنی ماں کی دی ہوئی قابل قدر آزادی کا کبھی غلط استعمال

نہیں کیا۔ خاص کر اس لئے بھی کہ مجھے احساس تھا کہ اگر میں نے ایسا کیا تو اس کی سزا میری چھوٹی بہنوں کو بھگتنی پڑے گی۔"

مارچ 1985ء کی ایک شام کو کوئی چالیس افریقی طالب علم لڑکے اور لڑکیاں ایک بارات کی صورت میں شاہدہ کو بیاہنے کے لئے کراچی سے ماتلی پہنچے۔ اور تھوڑی دیر کے بعد جب یہ پردیسی باراتی ماتلی کے شیدیوں میں گھل مل گئے تو یہ پتہ لگانا مشکل ہو گیا کہ افریقی باراتی کونسا تھا اور ماتلی کا شیدی کونسا۔ اور پھر کچھ دل ہلا دینے والے مشاہدات دیکھنے میں آئے۔ گھانا کے عباس کو شیدی عورتوں میں اپنی خالہ کا گمان ہوا۔ عثمان نے ایک لڑکا دیکھا جو ہو بہو اس کا چھوٹا بھائی تھا۔ مگر تنزانیہ کے نکی ماتاوا کے لئے یہ تجربہ جذباتیت کی حدود سے زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔ تنزانیہ کے تعلیمی اداروں میں غلامی کی تجارت کے المیہ کو تاریخ کے مضمون کے طور پر پڑھایا جاتا ہے۔ اور ماتلی پہنچ کر نکی ماتاوا کو اچانک یوں محسوس ہوا کہ جیسے وہ اس تاریخی حقیقت کے منہ میں جھانک رہا ہو۔

شیدیوں سے مل کر کبھی وہ رو دیتا اور کبھی لپٹ لپٹ کر ان سے اس طرح پیار کرتا جیسے کوئی اپنے بچھڑے ہوئے عزیزوں سے کرتا ہے۔ پھر اس نے مدہوش ہو کر "موگو" پر ناچ کیا جس کو شیدی موگورمان کہتے ہیں۔ نکی کے لئے یہ موقع تاریخی نوعیت کا ہی نہیں بلکہ ایسا تھا جو دل پر اپنے نشانات ہمیشہ کے لئے چھوڑ جاتا ہے۔

اگلے ماہ شاہدہ گھانا جا رہی ہے۔ عربی زبان میں گھانا کا مطلب ہے خزانہ یا دولت۔ مگر انگریزی میں گھانا کے قرب و جوار کے ساحل کو ساحل غلاماں بھی کہتے ہیں اور سونے کا ساحل بھی۔ مگر اپنے بدنصیب اجداد کی طرح اس دفعہ سمندری لہروں پر ڈولتے ہوئے غلاموں سے بھرے جہاز پر سوار نہیں ہو گی۔ بلکہ اس دفعہ وہ ماضی کی سیج پر بیٹھی پیار بھرے بندھن کے دھاگوں میں لپٹی ہوئی روح کے ساتھ آسمانوں پر پرواز کرے گی۔ اس دفعہ بندھن کی یہ زنجیریں گلاب کی پتیوں۔ چنبیلی اور موتیا کے ہاروں سے بنی ہوں گی۔ اس بار اس کے بندھن میں غلامی کی مار نہیں ہو گی بلکہ خلوص اور احترام بھرا پیار ہو گا۔ شاہدہ افریقہ کی دلہن کے طور پر اپنی قدیم جڑیں ڈھونڈنے جا رہی ہے۔

اس واقعہ کے ٹھیک ایک سال بعد شاہدہ کی چھوٹی بہن شاہین نے بھی اپنی بڑی بہن کے نقش قدم پر چلتے ہوئے تنزانیہ کے محمود کمپنوڑا سے شادی کی۔ اس طرح دونوں بہنیں افریقہ کے مغربی اور مشرقی ساحلوں پر واپس پہنچ گئیں جہاں سے بیشتر شیدیوں کو لایا گیا تھا۔

ہو سکتا ہے کہ دونوں بہنوں کا یہ دلیرانہ قدم انجانے خطرات سے خالی نہ ہو مگر ایک بات صاف ہے کہ خواہ یہ قدم کتنا ہی چھوٹا سہی مگر تاریخی نوعیت کا حامل ضرور ہے۔

ھارلیم کا شیڈی ڈرامہ نویس

مین ہٹن میں (MAN HATTAN) براڈوے (BROAD WAY) پر واقع لنکن سینٹر (LINCON CENTRE) کے نام سے نیو یارک کا مشہور ثقافتی مرکز ہے جہاں قومی اقلیتیں اکثر اپنے ثقافتی میلے اور دیگر پروگرام منعقد کرتی ہیں۔ اگست 1987ء میں جب میں اس جگہ کے قریب ہی رہتا تھا تو وہاں ہارلیم کی ایک تاریخی شخصیت "مارکس گاروی" کا ہفتہ منایا جا رہا تھا۔ جزائر غرب الہند۔ لاطینی امریکہ اور افریقہ سے آئے ہوئے درجنوں طائفے اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ ان کے ناچ گانے اور ڈرامے بہت ہی دلفریب تھے اور دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے۔ یہاں ہی اتفاق سے مجھے ہارلیم کے ایک نامور تھیٹر گروپ جس کو افریقی کیریبین۔ شاعری تھیٹر کہا جاتا تھا۔ ان کے بانی فنکاروں سے ملنے کا اتفاق ہوا اور انہیں کے ذریعہ مجھے ہارلیم کی اندرونی معاشرتی زندگی میں جھانکنے کا بھی موقع میسر آیا۔ اس گروپ کو مخفف کے طور پر اے۔ سی۔ پی۔ ٹی کہا جاتا تھا۔ اے۔ سی۔ پی۔ ٹی ثقافتی پروگراموں کے ساتھ ساتھ شاعری۔ ادب' پرفورمنگ آرٹ پیش کرتی تھی جس میں تھیٹر ورکشاپ پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔ گو کہ اے۔ سی۔ پی۔ٹی 1980ء میں قائم کی گئی تھی مگر اب اس کو جان شمس العالم اور سانڈرا ماریہ ایسٹیو کے نام سے ایک نہایت باصلاحیت خاوند۔ بیوی کا جوڑا چلاتا تھا۔

ہسپانوی ہارلیم کے علاقہ ساوتھ برونکس کے تشدد آمیز ماحول میں پیور ٹوریکن اور ایشائی والدین کے ہاں جنم لینے والے شمس العالم نے ڈرامہ نویس اور فنکار کی حیثیت میں اپنی گھیٹو (GHETTO) کے لوگوں کی پیچیدہ اور دکھی زندگی کو اظہار بیان کا ذریعہ بنا کر اپنے لئے بڑا نام پیدا کیا تھا۔

ماریہ ایسٹیو بنیادی طور پر شاعرہ تھی اور شاعری کے مشہور مجموعوں "عام عورتیں" اور "دوسری دنیا" میں شامل کی جا چکی تھی۔ 1982ء میں شمس العالم کا ناٹک "بین پائر" پولیٹزر پرائز (PULITZER PRIZE) کے لئے چنا گیا۔ اس کے علاوہ پانچ ولیج ایوارڈ اور ایک او۔ بی حاصل کیا۔ حال ہی میں اس کا ایک ناٹک "حکیم" پردو یونیورسٹی کے منتخب ادبی

کشکول میں شامل ہونے والا پہلا ہسپانوی ناٹک تھا۔ دوسرے اقلیتی ناٹک نویسوں کی طرح شمس العلام بھی ہارلیم کی گلیوں اور نکڑ کے لوگوں کی زندگی سے معنویت حاصل کرتا تھا جن کے درمیان وہ پل کر جوان ہوا۔ بچپن ہی سے قانونی اداروں سے آنکھ مچولی کھیلنا اور جیلوں کی ہوا کھانا ہارلیم کے عام لوگوں کی طرح اس کا بھی ایک طویل عرصہ تک مقدر بنا رہا۔

"میں نے چاروں طرف سے اپنے آپ کو مسائل میں گھرا ہوا پایا۔ گو کہ میں ایک سے زیادہ دفعہ عمر قید کی سزا سے بچ نکلا مگر شروع شروع میں مجھے جیلوں کا بیشتر وقت اصلاحی سکولوں میں گذارنا پڑا" شمس العالم نے بتلایا کہ اس کی ابتدائی تعلیم جیل خانوں کے سکولوں میں ہوئی اور وہیں سے نیوروشیل کالج سے کورس بھی پاس کئے۔ 1975ء میں اس کی زندگی میں ایک ایسا موڑ آیا جس نے اس کی بقیہ زندگی بدل کر رکھ دی۔ لنکن سینٹر کے پاس سے گذرتے ہوئے ایک دن اس نے پیور ٹوریکن سفری تھیٹر کا پوسٹر چسپاں دیکھا اور ناٹک دیکھنے کے لئے ہال میں داخل ہوا۔ اس نے ناٹک کیا دیکھا کہ ہمیشہ کے لئے اس کی روح اس میں الجھ کر رہ گئی اور اس نے اس کمپنی میں شمولیت اختیار کر لی۔ اس کے بعد اسے فریڈ ہڈسن اور ایلن ڈیوس جیسے کہنہ مشق فنکاروں کے زیر سایہ کام کرنے کا موقع ملا جنھوں نے اسے پرفورمنگ آرٹ کے اصول اور دیگر ضروریات سے پوری طرح روشناس کرایا۔ شمس العالم کو اپنی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے کمپنی میں اپنا لوہا منوانے اور منفرد نام پیدا کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ اور پھر اسے کبھی پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ضرورت نہیں پیش آئی اور اب وہ مقبول ترین ناٹکوں کے مصنف کی حیثیت سے مشہور ہے۔

شمس العالم کی بیوی سانڈرا ماریہ ایسٹیو بھی جنوبی برونکس کے ہسپانوی ہارلیم میں پیورٹو ریکن اور ڈومینکن نژاد والدین کے ہاں پیدا ہوئی۔ اور اسی لئے اس کی تمام تخلیقات میں اس دوہری قومیت کے کھچاؤ اور شناخت کا گہرا اثر ملتا ہے اور جس کا اظہار اس کے کیربین اور شمالی امریکی لب و لہجے کے گڈمڈ ہونے سے ملتا ہے۔ ماریہ نے بھی اے۔ سی۔ پی۔ ٹی کے فروغ کے لئے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ وہ مصنفہ اور فنکارہ کے ساتھ ساتھ ہسپانوی ناٹکوں کی لائق پروڈیوسر بھی رہی ہے۔ اس سلسلہ میں اس کا میدان موسیقی اور ویڈیو سے لے کر ڈوکیو منڑیوں تک پھیلا پڑا ہے۔ اس نے "ایل گروپو" کے نام سے ایک "ایل پی" بھی ریکارڈ کیا ہے۔ چینل نمبر 13 پر "کوچی فریتو۔" "اسپل پائی" اور "سالسہ" کے نام سے سیریل فیچر فلمیں بھی بنائی ہیں۔ اس کے علاوہ ماریہ ایک اچھی گرافک آرٹسٹ بھی ہے۔

اپنی بیوی کی طرح شمس العالم کا تعلق بھی "فیملی ریپرٹری کمپنی" کے علاوہ "انترا" یعنی

INTERNATIONAL ARTS RELATION سے بھی رہا ہے۔ اس کے ڈرامے آف براڈوے تھیٹروں۔ گرجوں اور تعلیمی اداروں میں بھی دکھائے گئے ہیں۔ حال ہی میں وہ "ا لپسینو" نام کے فنکار کا سکرپٹ کنسلٹنٹ بھی رہا ہے۔

ماریہ اور شمس العالم چونکہ دونوں ہی افریقی کیریبین اور لاطینی انڈین کی شاملاتی نسل سے ہیں اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اے۔ سی۔ پی۔ ٹی کے اکثر ناٹکوں کے سیاسی اور سماجی مسائل کا تعلق لاطینی انڈین اور افریقی نژاد لوگوں کی الجھنوں سے ہوتا ہے۔

1986ء میں پیش کئے گئے شمس العالم کے ایک ناٹک "حکیم" میں یہ موضوع صاف عیاں ہے۔ ناٹک ہسپانوی۔ افریقی نژاد دو پیورٹو ریکن دوستوں کی تقابلی شناخت کے گرد گھومتا ہے۔ یعنی حکیم جو کالا مسلمان فنکار ہے اور اس کا پرانا دوست پیڈرو جس نے گورے عیسائیوں کے اکثریتی سماج میں جگہ بنانے کے لئے اپنا نام بدل کر پیٹر رکھ لیا ہے۔ اس ناٹک میں دونوں دوستوں کا آمنا سامنا ہوتا ہے جس میں حکیم اپنے پیورٹو ریکن ہسپانوی اور افریقی جڑوں کو فخر سے قبول کرتا ہے جب کہ پیڈرو یا پیٹر اپنی اقلیتی شناخت سے کنارا کشی کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی طرح کے ثقافتی اور سماجی مسائل اے۔ سی۔ پی۔ ٹی کے مخصوص موضوعات ہوتے ہیں۔

شمس العالم جو اے۔ سی۔ پی۔ ٹی کے سیاسی نظریات کی بابت چشم پوشی سے کام نہیں لیتا۔ ایمان رکھتا ہے کہ ایک اچھے فنکار کو سماج کے ان حقیقی مسائل کو موضوع بحث بنانا چاہئے جن سے عام لوگ ڈر کے مارے کتراتے ہیں۔ شمس العالم کے مطابق۔ اے۔ سی۔ پی۔ ٹی۔ ان چند ایک تھیٹروں میں سے ہے جو کالے ہسپانیوں کی زندگی کو موضوع بحث بناتے ہیں۔ بیشتر لاطینی تھیٹر کمپنیاں اپنی افریقی جڑوں سے پہلوتہی کرتی ہیں اور اپنے افریقی رشتوں کو قبول نہیں کرتیں۔ وہ اس سچائی کو قبول نہیں کرتیں جو وہ پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کی دلیری اور راست بازی کی وجہ سے اے۔ سی۔ پی۔ ٹی کو خاصی مالی اور فنی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ چند ایک اداروں کی معمولی سی مدد کے علاوہ کمپنی سخت مشکل حالات میں اپنی مدد آپ کے اصول پر کام کرتی ہے۔ اس کے پاس نہ ہی تو کوئی اپنا تھیٹر ہے اور نہ ہی دفتر۔ کمپنی کی سات سالہ تاریخ میں اس کی ریہرسلیں کاروں میں بیٹھ کر ہوتی ہیں۔ یا پڑوس کی باروں میں بیٹھ کر اور یا پھر جلدی میں کرائے پر لی ہوئی ٹوٹی پھوٹی اپارٹمنٹ میں۔ ان تمام مشکلات کے باوجود اے۔ سی۔ پی۔ ٹی نے بہت اعلیٰ

درجہ کے ڈرامے پیش کئے ہیں۔ رواں سال "حکیم" کے علاوہ کمپنی نے "پرپل پیراڈائز" PURPLE PARADISE امپیکٹ IMPACT اور STUFF SWEET بھی پیش کئے۔ جن میں روحانیت۔ جرائم۔ پولیس کی زیادتیاں اور جیل میں عورتوں کی حالت پر بحث کی گئی ہے۔ جب کبھی ممکن ہو تو برونکس کمیونیٹی مرکزوں میں یہ کھیل مفت دکھلائے جاتے ہیں۔

میں نے انٹرویو کی غرض سے ساؤتھ برونکس میں ان کی رہائش گاہ پر ٹیلیفون کیا۔ ماریہ نے بتلایا کہ شمس العالم اپنی بہن الامو ALAMO کے ساتھ عدالت گیا ہوا ہے جہاں وہ چوراسی (84) گھروں کی ایک پرانی اپارٹمنٹ بلڈنگ کو بچانے کی کوشش کر رہے ہیں جسے گرا کر انتظامیہ اونچے درجہ کی بلڈنگ بنانا چاہتی ہے۔ اگر ایسا ہوا تو یہ غریب لوگ جو اس میں رہتے ہیں ہمیشہ کے لئے اجڑ جائیں گے۔ ماریہ نے اگلے دن آنے کو کہا۔

دوسرے دن میں زمین دوز ریل گاڑی کے ذریعہ ہسپانوی ہارلیم پہنچا۔ باہر سڑک کے ایک طے شدہ نشان پر شمس العالم کو منتظر پایا۔ اور ہم مل کر یوں بغل گیر ہوئے جیسے برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔

ہارلیم نیو یارک میں کوئی تیس لاکھ کالے۔ پیلے اور رنگین لوگوں کی غریب بستی ہے جس کو حرف عام میں سلم SLUM یا گھیٹو GHETTO بھی کہا جاتا ہے۔ ہارلیم کو ایک نظر دیکھنے پر یوں لگا جیسے امریکی ہوائی جہازوں نے بمباری کر کے اسے حال ہی میں تباہ کیا ہو۔ ٹوٹے پھوٹے اور جیسے آگ میں جھلسے ہوئے چھوٹے چھوٹے کچی آبادی نما مکانوں یا کیئے کوارٹروں کی قطاریں۔ ان کے کھلے دروازوں اور کھڑکیوں میں بیٹھے بے حس اور بے حرکت بوڑھے اور بچے خلاؤں میں گھورتے یوں لگتے ہیں جیسے زندگی سے مکمل طور پر خالی ہوں یا عاری ہوں۔ اور جیسے کسی بڑے قتل عام کی بچی کھچی باقیات ہوں۔ امریکہ کا یہ اصل اور چھپا ہوا دوسرا چہرہ دیکھے بنا امریکی گورے سماج کو سمجھنا ناممکن ہے۔ کیونکہ امریکی معاشرہ بہت چالاکی کے ساتھ اسے چھپائے رکھتا ہے تاکہ اس کا آزادی اور انصاف کا بھرم قائم رہے اور تیسری دنیا کے غریب عوام کو الو بنا کر لوٹ کھسوٹ جاری رکھے۔ بہرحال شمس العالم مجھے پاس کی ایک ٹوٹی پھوٹی بلڈنگ میں لے گیا۔ کمرہ کیا تھا جیسے آسیب زدہ کھنڈر۔ مگر شمس العالم کی آنکھوں کی چمک اور ہونٹوں پر لاابالی سے کھیلتی ہوئی مسکراہٹ نے مجھے اس کا کچھ احساس نہ ہونے دیا۔ اور مجھے یہاں کسی قسم کی اجنبیت کا احساس نہیں ہوا کیونکہ میرے گاؤں کی بھیل بستی اس جگہ سے کسی طرح بھی مختلف نہ تھی۔ اتنے میں چند ایک شیدی لڑکے۔ لڑکیاں اور بچے بھی ہمارے گرد آ بیٹھے اور خوش گپیاں کرنے لگے۔ قومی

شناخت کے المیہ پر بات کرتے ہوئے شمسول نے بتلایا کہ اس کی ماں آدھی پیورٹو ریکن اور آدھی کالی امریکن یعنی شیدی تھی۔ جب کہ اس کا باپ بنگالی مسلمان تھا اور جس کا نام شمس العالم تھا۔

"بنگالی!" میری جیسے چیخ نکل گئی۔ میرا خیال ہے ماریہ نے مجھے ٹیلیفون پر بتلایا کہ وہ یمنی عرب تھا۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں! ہم گھیٹو کے لوگوں میں نسلی کھچڑی پکی ہوتی ہے اور عام طور پر یہ لوگ اس کو اہمیت نہیں دیتے۔ ہم میں افریقی۔ لاطینی۔ انڈین۔ عرب یہاں تک کے چینی بھی گڈمڈ ہیں اور گورے آقا کا ذکر ہی کیا ہے وہ تو ہماری نس نس میں موجود ہے۔ اس لئے ہم موقع محل کے تحت ان سب کے ساتھ شناخت کر سکتے ہیں۔ مگر حقیقت میں میرا باپ کلکتہ کا بنگالی مسلمان تھا جو 1945ء میں نیویارک آیا اور پھر غیر قانونی شہری ہونے کی بنا پر جلاوطن کر دیا گیا۔ میں اس وقت اپنی ماں کے پیٹ میں تھا۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد میری ماں کی غلطی سے اس کا اتہ پتہ گم ہو گیا۔ اور پھر وہ کبھی نہیں ملا۔ اس طرح پیدائش سے یتیم اور باپ کی شفقت سے محروم ہارلیم کے بیشتر بچوں کی طرح میں محض زندہ رہنے کے لئے لڑتا بھڑتا گلیوں میں پل کر جوان ہوا۔ ہارلیم کی گلیوں میں جو ریاستی تشدد اور جوابی تشدد کے لئے مشہور ہیں میں نے بچپن ہی سے پولیس اور جیل خانوں کے سایہ میں جینا سیکھا۔

مگر قید خانوں کی کال کوٹھریوں کی تنہائی کے دوران میں اکثر اپنے باپ کے بارے میں سوچا کرتا اور مجھے اس کی محرومی کا احساس بہت ستاتا۔ ہو سکتا ہے ہندوستان میں اس نے دوسری شادی کی ہو اور میرے وہاں دوسرے بہن بھائی بھی ہوں۔ میں اب بھی اکثر اسے ڈھونڈتا رہتا ہوں۔ میں ٹیلیفون ڈائریکٹری میں ایسے ناموں کی شناخت کرنے کی کوشش کرتا ہوں جو عالم پر ختم ہوتے ہوں۔ اس لئے ہر عالم اب میرے لئے ہونے والا بھائی بن گیا۔ میں نے اکثر کلکتہ اور ڈھاکہ جا کر اپنے خاندان کو ڈھونڈ نکالنے کے خواب دیکھے ہیں۔ اس طرح شناخت اور ثقافت کا المیہ یوں سمجھو اس گوری دنیا میں ورثے کے طور پر ملا ہے۔

مجھے شمس العالم کے ساتھ بات چیت کرتے ہوئے اتنا حساس موضوع چھیڑ کر تھوڑا سا دکھ سا محسوس ہوا۔ میں نے اس کا دل رکھنے کے لئے کہا کہ "کاش میرا نام خورشید عالم ہوتا۔ پھر بھی تم مجھے اپنا بھائی ہی سمجھو اور اس پر تمہیں کبھی مایوسی نہیں ہوگی۔" یہ سن کر اس کی شرمیلی آنکھوں اور مسکراتے ہونٹوں پر خوشی کی ایک لہر سی دوڑ گئی ____

شمس العالم ایک خوشنما اور خوبصورت شخصیت کا مالک تھا۔ گو ایک ملاقات میں تفصیلی

بات چیت تو نہیں ہو سکتی تھی۔ اور بدقسمتی سے اس کے دوسرے ہی دن مجھے نیویارک سے کیناڈا کے شہر مانٹریال جانا تھا۔ اس لئے ہماری یہ مختصر اور دلچسپ کچہری اختتام کو پہنچی۔ مگر جدائی سے قبل میں نے اس سے وعدہ کیا کہ میں زندگی میں جہاں کہیں بھی ہوں اسے اپنے بھائی کی حیثیت میں یاد رکھوں گا۔

تین عورتیں

تقسیم ہند کے خونریز نسلی فسادات نے کتنے صدیوں سے بستے رستے گھر اجاڑے کتنے دل توڑے۔ کتنے معصوم بچوں اور عورتوں کی بے حرمتی کی یہ تو شاید کبھی کوئی نہ بتلا سکے گا۔ مگر ایک بات صاف ہے کہ اس دور کے بھٹکے ہوئے لاکھوں لوگوں کو اب صدیوں تک بستے رستے گھروں کا امن و سکون اور چین نصیب نہیں ہو گا۔ کیونکہ معاشرہ کی بنیاد اگر تباہی و بربادی پر رکھی جائے تو چین اور سکھ کیسا؟

بد قسمتی سے میرا جنم بھی ہندوستان کے ایسے ہی لوگوں میں ہوا جن میں بھٹکنا نہ صرف پیشہ ورانہ ثقافت تھی بلکہ مذہب کے نام پر بھٹکنا تو عین سنت سمجھا جاتا تھا۔ مگر میں نے بچپن ہی سے اس قسم کے رجحانات کو قبول نہیں کیا۔ ہو سکتا ہے اسی لئے میں نے پیدائشی باغی کی سی زندگی گزاری ہے۔ یوں بھی بھٹکنے اور بغاوت کا تو چولی دامن کا ساتھ ہے اور اب تو یوں لگتا ہے کہ ہمیشہ کے لئے بھٹکتا ہی رہوں گا۔ شاید اسی لئے مجھے ہر بھٹکتے انسان کے ساتھ ہمدردی ہے۔ میں نے سندھ میں اپنے نئے گاؤں کی تین عورتوں کی کہانی اسی اظہار ہمدردی کے طور پر لکھی ہے۔

بھمی ادھیڑ عمر کی ایک ہندو عورت تھی۔ فسادات کے دوران جب اس کا خاندان ہندوستان کو ہجرت کرنے کی تیاری کر رہا تھا تو اس کا ننھا بچہ اچانک غائب ہو گیا۔ بھمی پاگلوں کی طرح اپنے بچے کو ڈھونڈتی ڈھونڈتی خود بھی پاگل ہو گئی۔ اس کا خاوند اس کو اسی حالت میں چھوڑ کر ہندوستان چلا گیا۔

گو میں خود ابھی بچہ ہی تھا اور نیا نیا ٹنڈو اللہ یار میں لایا گیا تھا۔ جیسا کہ اب کبھی کبھی میں مذاق میں کہتا ہوں کہ میرے والدین مجھے وہاں اغوا کر کے لائے تھے۔ خیر تو بھمی میلے کچیلے چیتھڑوں میں لپٹی دن بھر گاؤں کی گلیاں ناپتی اور جب کسی عورت کو چھوٹے بچے کے ساتھ آتا دیکھتی تو دوڑ کر اس بچے سے لپٹ جاتی اور پھر پکار پکار کر اس عورت سے فریاد کرتی۔ " بھگوان کے لئے میرا بچہ مجھے واپس دے دو۔ میرا بچہ واپس کردو۔ " کئی برس بیت گئے اور وہ اسی طرح اپنے بچے کو ڈھونڈتی ڈھونڈتی ایک دن خود بھی بھگوان کو پیاری ہوئی۔

انسان کی یادیں اکثر عارضی ہوتی ہیں اور وقت زمانے کے بڑے سے بڑے گھاؤ بھی بھر دیتا ہے۔ مگر کچھ گھاؤ ایسے ہوتے ہیں جو زمانے کے منہ پر اپنے بدنما داغ ہمیشہ کے لئے چھوڑ جاتے ہیں۔ جھمی کا درد بھرا گھاؤ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔

رانی تو آج بھی زندہ ہے۔ یہ تو پتہ نہیں کہ وہ کب پاگل ہوئی یا کب گھونگھٹ اتار پھینکا۔ کیونکہ جس زمانے میں اسے حادثہ پیش آیا اس زمانہ میں نوجوان ہندو بیوہ کے لئے گھونگھٹ اتار پھینکنا پاگل پن ہی سمجھا جاتا تھا۔ جیسا کہ پاکستان کے مسلمان معاشرے میں آج تک سمجھا جاتا ہے۔

مگر کہتے ہیں کہ سندھ کے ہندو بنیوں میں بنگال جیسے دور دراز علاقوں سے سستے داموں عورت خرید کر بیاہ لانے کا رواج عام تھا۔ اس زمانہ میں اس قسم کی عورت کو ولایتی' کہا جاتا جسے پنجرے کے پنچھی کی طرح پردے کی سخت ترین عقوبتوں سے گزرنا پڑتا اور وہ بیشتر درمیانہ طبقہ کی مسلمان عورتوں کی طرح اندر ہی اندر کملا مرجھا کر ختم ہو جاتیں۔

رانی بھی سانولی سلونی ایک خوبصورت ولایتی عورت تھی جسے ہوندا نام کا ایک خوشحال دکان دار بنگال سے بیاہ کر ٹنڈو اللہ یار لایا تھا۔ ہوندا اکثر بیمار رہتا اور تقسیم ہند کے فسادات کے دوران چل بسا یہ وہ وقت تھا جب دوسری طرف ہندوستان سے اسی قسم کے لوگ جوق در جوق سندھ پہنچ رہے تھے۔ رانی خوف کے مارے اپنے خاوند کی مردہ لاش لئے بند مکان ہی میں بیٹھی رہی۔ مہاجروں میں بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں تھی جن کا ہندوستان میں سب کچھ کھو جانے کے بعد اب دماغ چل گیا تھا۔ ایسے ہی کسی شخص نے ہوندا کی لاش کو ٹھکانے لگا کر اس کے مکان پر قبضہ کر لیا۔ رانی چپ چاپ مکان سے نکل کر دہلیز پر آ بیٹھی۔ اس بات کو اب چالیس سال بیت چکے ہیں مگر پھر کسی نے رانی کو بولتے نہیں سنا۔ وہ نیم عریاں حالت میں دن بھر اردگرد کی گلیوں میں گھومتی رہتی ہے اور پھر گرمی ہو یا سردی رات بھر اس دہلیز پر پڑی بظاہر چین سے سوئی رہتی ہے۔ گو اب اڑوس پڑوس کے کچھ نرم دل محلے والے اس کے روٹی ٹکڑے کا خیال رکھتے ہیں اور وقتاً" فوقتاً" اس کے عریاں جسم کو نئے کپڑوں لتوں سے ڈھانپنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ مگر ایک آدھ دن کے بعد رانی عریاں کی عریاں ہی نظر آتی ہے۔ اس کے سر کے بال اکثر منڈے ہوئے ہوتے ہیں۔ سر اور پیروں سے ننگی رانی کی موجودہ زندگی میں دہلیز پر پڑی ایک میلی کچیلی گودڑی اس کا واحد اثاثہ ہے۔ وہ کبھی کسی سے کوئی سوال نہیں کرتی۔ بلکہ خاموش بیٹھی خلاء میں گھورتی رہتی ہے۔ مگر کبھی کبھار صبح سویرے وہ گاؤں کے گندے پانی کے تالاب میں اشنان کرتی بھی

دیکھی جاتی ہے۔

گو میں بچپن سے رانی کو دیکھتا آیا ہوں۔ مگر میں نے کبھی بھی رانی کے وجود کا سنجیدگی کے ساتھ نوٹس نہیں لیا۔ جب کبھی وہ مجھے نظر آتی تو میں بڑی بے اعتنائی سے نظر بچاتا اس کے پاس سے گزر جاتا بالکل اسی طرح جیسے کوئی گلی کے ایک مخصوص نکڑ یا دہلیز پر کسی مخصوص کتے کو ہمیشہ بیٹھا یا سوتا دیکھنے کا عادی ہو جاتا ہے اور پھر جیسے کچھ عرصہ کے بعد ذہن اس کا نوٹس ہی لینا چھوڑ دے۔

سکول اور پھر کالج کے زمانہ کے بعد میں ایک طویل عرصہ کے لئے پیشہ ورانہ دنیا میں گم ہو کر اپنے گاؤں سے بہت دور نکل گیا اور کئی دہائیوں کے بعد واپس لوٹا تو میں نے محسوس کیا کہ رانی کے تصورات کے ساتھ کچھ موہوم سی یادیں میرے لاشعور ذہن کے ساتھ اب بھی چپکی تھیں۔ مثلاً بچوں کا وہ غول جو ہاتھوں میں کنکر اور پتھر لئے رانی کا پیچھا کرتا اور شور مچا کر چھیڑتا اور رانی بپھری ہوئی شیرنی کی طرح ان کے پیچھے دوڑتی اور جوابی پتھراؤ کرتی۔ اور کبھی بھونکتے ہوئے کتے رانی کی آمد کا پتہ دیتے یا پھر شروع شروع کے ایام میں جب رانی کے جاذب خدوخال میں ابھی جوانی کی کسک باقی تھی تو خوفناک اندھیری راتوں میں وحشی اور درندہ صفت انسانوں کے ہاتھوں رانی کے ہوس کا نشانہ بننے کی گشت کرتی ہوئی کھسر پھسر۔

اور اب کوئی پچیس سال کی خانہ بدوشی کے بعد میں گاؤں واپس لوٹا تو اب وہ ایک بڑا سا قصبہ بن چکا تھا اور نہ ہی میں بھی اب وہ لاابالی انسان تھا جو ایک دن گاؤں چھوڑ کر گیا تھا۔ در بدر کی ٹھوکریں کھا کر میں بھی اپنے گاؤں کی طرح بہت بدل گیا تھا۔ علم اور عمل کی جدلیات نے اب میرے ذہن کے سوتے جگا دیئے تھے۔ سوچ کے جس حصہ کو میں لاشعور سمجھتا تھا وہ اب شعور کی نئی پرت بن کر عقل پر چھا گیا تھا۔ غرضیکہ میرے ذہن میں مشاہدات، منطق اور تجزیات کی نئی دنیا جنم پا چکی تھی۔ اب میں نے گلیوں میں چھوٹی چھوٹی چیزوں کا سنجیدگی اور باریک بینی سے نوٹس لینا شروع کر دیا تھا جن پر پہلے کبھی نظریں ہی نہیں ٹکی تھیں۔

ایک دن بازار سے گزرتے وقت میں نے رانی کو اسی دہلیز پر بیٹھے دیکھا تو وہ مجھے سچ مچ کی رانی نظر آئی۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سا پرشکوہ وقار تھا اور اس کے بیٹھنے کے انداز میں ایک ملکہ کی سی شان اور تمکنت تھی۔ بے یقینی کے ساتھ رک کر میں نے غور سے اسے دیکھنا چاہا۔ مگر ایک اچٹتی سی نظر ڈالنے کے بعد میری ہمت جواب دے گئی۔ میں

نے یکلخت نظریں بچا کر تیزی کے ساتھ اس کے پاس سے گزرنے کی کوشش کی تو مجھے یوں لگا جیسے میرے پاؤں شل ہو کر زمین پر یوں گھسٹنے لگے ہیں جیسے ان پر بہت بڑا بوجھ آن پڑا ہو۔ اس کے کٹے ہوئے سر کے بال اب کھچڑی بن چکے تھے۔ اس کا ننگا اور دبلا جسم اب ڈھلک کر لٹکنے لگا تھا۔ اس کا سانولا رنگ اب سیاہی مائل ہو گیا تھا۔ مگر اس کی آنکھوں میں اب بھی بلا کی چمک اور جاذبیت تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے لحہ بھر کے لئے اس نے مجھے گھورا ہو اور اس کی نظریں جلتے تیر کی مانند میرے سر سے آر پار ہو گئی ہوں۔ میں فوراً ساتھ والی گلی میں مڑ کر غائب ہو گیا جہاں رانی کی دہلیز سے چند گز کے فاصلہ پر میرا آبائی گھر تھا۔

پرانے ٹنڈو اللہ یار کی تنگ و تاریک گلیوں سے گزرتے وقت اکثر مجھے موئن جودڑو کے آثار قدیمہ کا احساس ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ موئن جودڑو اپنی پتلی اور خوبصورت نانک شاہی اینٹوں کی بلڈنگوں اور شاہراؤں کی بناوٹ کے لحاظ سے تاریخی عجوبہ ہے جبکہ موجودہ ٹنڈو اللہ یار غلاظت کا ایک ڈھیر' چار تاریک اور بل کھاتی ہوئی گلیاں گاندھی چوک میں جا کر کھلتی ہیں۔ ایک گلی جو شیدی پاڑے کی طرف جاتی ہے اس میں ایک غار نما چھوٹا سا مکان ہے۔ اس مکان کے سامنے کی چھوٹی سی دہلیز پر پتھر کی طرح ساکت ایک ٹھیائی ہوئی پستہ قد بڑھیا بیٹھی نظر آتی۔ اس کی ناک پر بڑی سی سنہری لونگ جڑی ہوتی اور اس کے پتلے پتلے ہاتھوں پر مہندی لگی ہوتی۔ اس کے ہرنی جیسے نرم و نازک ٹخنوں پر چاندی کی گھنگھریالی پائل دیکھ کر اس بڑھیا پر مجھے نوبیاہتا دلہن کا گمان ہوتا۔ وہ ایک مہاجر عورت تھی جو صبح شام جمود کی سی کیفیت میں چپ چاپ اور تن تنہا دہلیز پر بیٹھی گلی سے ہر آنے جانے والے کو اپنی بھوری آنکھوں سے بندریا کی طرح پلک جھپک کر یوں گھورتی رہتی جیسے اسے کسی کا انتظار ہو ___ اور یا پھر جیسے اس مکان نما غار نے اسے ہمیشہ کے لئے باہر گلی میں اگل دیا ہو۔

میں نے اس گلی سے گزرتے ہوئے کئی دفعہ سوچا کہ اس سے پوچھوں کہ "اماں تم کو کس کا انتظار ہے؟" مگر ہر دفعہ میں اس خیال سے ٹال مٹول کر کے گزر جاتا کہ اجنبیوں سے بات کرنے اور درد بھری داستانیں سننے سے مجھے کچھ خوف سا آنے لگا تھا۔ ایک دن پاس سے گزرتے وقت جی کڑا کر کے میں ڈرتا ڈرتا بڑھیا کے قریب چپکے سے جا بیٹھا۔ لحہ بھر کے لئے اس نے مجھے غور سے گھورا اور پھر بچوں کی طرح کھل کر مسکرا دی۔ میں نے کہا "اماں تم دن بھر اس دہلیز پر کیوں بیٹھی رہتی ہو؟"

"کیا کروں بیٹا۔ یہ اندھیاری کوٹھری تو مجھے کاٹنے کو آتی ہے اور پھر اندر بیٹھ کر کیا

دیواروں سے باتیں کروں؟" اس نے پان چباتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔
"اوہ! تو کیا تم تنہا ہو۔ تمہاری اولاد نہیں ہے؟" میں نے ازراہ ہمدردی پوچھا۔ "تھے تو بہت اللہ کے دیئے پر ایک ایک کر کے سب اللہ کو پیارے ہوئے۔" اس نے دکھ بھری آواز میں کہا۔ "اب تو بس موت کا انتظار ہے۔ کمبخت وہ بھی تو نہیں آتی۔"
اف! "میں نے سوچا۔ جوانی کے چالیس برس تو اس عورت نے اپنی جڑوں سے اجڑنے۔ اجنبی دنیا میں نیا گھر بنانے اور اپنے بچے دفنانے میں بتا دیئے اور اب بڑھاپے میں تن تنہا موت کی منتظر ہے۔ میں نے دل میں سوچا کہ بڑھیا سے کہوں کہ اماں یہ کام تو ہندوستان میں بھی بڑی خوش اسلوبی سے انجام پا سکتا تھا۔ تو پھر کیا اس کال کوٹھری میں تنہا بیٹھ کر مرنے کے لئے ہی اتنی دور نکل آئی تھی۔ مگر میں بھلا اتنا بے رحم سوال اس سے اس حالت میں کیسے پوچھ سکتا تھا۔
مگر بڑھیا نے جیسے میرے اندرونی ہیجان کو بھانپ لیا ہو۔ وہ ہلکے سے بڑبڑائی۔
"بیٹا! زندگی کبھی کبھی صحرائی آندھی کی طرح بے رحم ہو جاتی ہے۔ جس میں صدیوں پرانی بستیاں تنکوں کی طرح اڑ جاتی ہیں یا پھر ایک خوفناک سیلاب کی مانند الٹی ڈگر پر بہہ نکلتی ہے جس میں انسان کا کل اثاثہ غرق ہو جاتا ہے۔ تقسیم ہند بھی اسی طرح کی آندھی یا سیلاب کی مانند تھا۔ نہ تو زندگی ہی پر ہمارا بس ہے اور نہ موت پر جس کا انتظار ہے۔ یہ سب تو قدرت کا کھیل ہے۔" یہ کہہ کر وہ چپ ہو گئی اور پھر سے راہ گیروں کو گھورتی رہی۔
انہی دنوں میں کچھ عرصہ کے لئے بیرون ملک چلا گیا۔ اور جب لوٹا اور اس گلی سے گزرا تو دیکھا کہ دہلیز خالی پڑی ہے اور بڑھیا کی پراسرار کٹیا کے دروازہ پر تالا لگا ہے۔ کچھ دیر کے لئے میں بھی اس دہلیز پر بیٹھ کر آنے جانے والوں کو اسی طرح سے گھورتا رہا جیسے بڑھیا گھورا کرتی تھی۔

بے حجاب بے وفا

اندرون سندھ کے بیشتر قصبہ جات ماضی کے ڈھیر نظر آتے ہیں۔ اونچی دیواروں کے درمیان تنگ و تاریک گلیاں سانپوں کی طرح بل کھاتی ایک دوسرے میں الجھی دکھائی دیتی ہیں جن میں اجنبی مسافر اکثر گم ہو جاتے ہیں۔ پکی اور کچی اینٹوں سے بنے چھوٹے چھوٹے گھٹن اور تعفن سے بھرے گھروندے ایک دوسرے میں یوں گڈمڈ نظر آتے ہیں جیسے بوڑھے بیمار ایک دوسرے کے کندھوں کا سہارا لئے کھڑے ہوں۔ پھر بھی بظاہر یہ گھر ہرے، سفید اور سنہری گیرو کے رنگوں میں ملبوس گرمیوں کی کڑکتی دھوپ کی چمک سے دمکتے نظر آتے ہیں ____

ان گلیوں کے بیچوں بیچ بالعموم گندے پانی سے بھری نالیاں بہتی ہیں جو پورے قصبے کے لئے کھلے گٹروں کا کام کرتی ہیں۔ یہ گلیاں اتنی تنگ ہوتی ہیں کہ آمنے سامنے سے آنے والے دو شخص کندھا ٹکرائے بنا شاید ہی گزر پائیں۔ قصبے کی مرکزی گلی عموماً بازار بھی ہوتی ہے جو لکڑی کی چھت سے ڈھکی ہوتی ہے۔ اسے بند بازار بھی کہا جاتا ہے اور شاہی بازار بھی۔ تقسیم ہند سے قبل بنیوں کے زمانے میں ایسے بازاروں کا عام رواج تھا جو اب ختم ہوتا جا رہا ہے۔ ان بازاروں میں جھوم جھوم کر آہستگی سے چلتے اور سودا سلف خرید کرتے اطراف کے دیہات سے آئے ہوئے کسان چیونٹیوں کی قطار معلوم ہوتے ہیں اور ان کی خضاب زدہ گہری سیاہ داڑھیاں، لمبی مونچھیں اور سر پر بندھی ہوئی بوسکی کی پگڑیاں قابل دید ہوتی ہیں۔

اس قسم کے قدیم قصبے عموماً ٹنڈو کہلاتے ہیں۔ سندھی زبان میں ٹنڈو کے معنی کچھ غیر مبہم سے ہیں۔ مگر پڑوس کے صوبہ راجستھان کی مارواڑی زبان میں ٹانڈو کا مطلب ہے خاندان یا چولہے کی لو، میرے قصبے ٹنڈو اللہ یار کا نقشہ یا حدود اربعہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔

میں نے ایک دن ایک تنگ گلی میں ایک بڑھیا کو سامنے سے آتے دیکھا۔ وہ ایک تنبو نما برقعہ میں ملبوس بمشکل چل پا رہی تھی۔ اس نے میرے نزدیک سے گزرتے وقت آہستگی سے دیوار، نالی اور مجھ سے بہ یک وقت بچنے کی کوشش کی۔ اس کی عمر ستر برس کے لگ

بھگ ہو گی اور اور اس کی آنکھوں پر عمر کے ساتھ ساتھ موٹے سفید برقعہ کا پردہ پڑا تھا۔
مجھے یوں لگا کہ جب وہ میرے قریب سے ایک کہنہ مشق کرتب کار کی طرح گزری تو اس کے منہ سے ایک درد بھری آہ نکلی۔ میری دادی کی عمر کی اس بڑھیا نے مجھ سے یوں کنارا کیا جیسے میں اچھوت تھا اور مجھ سے چھو جانے سے اسے دھرم بھشٹ ہونے کا خطرہ تھا۔ اس کی تھکی تھکی سی آہ سن کر میرا کلیجہ پسیج گیا۔ ہو سکتا ہے وہ بیمار اور تنہا ہو اور اس کا آگے پیچھے کوئی نہ ہو میں نے سوچا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں اس کا بازو تھام کر حفاظت سے گلی پار کروا دوں۔ مگر مسلمان درمیانہ طبقہ کی کفن نما برقعہ میں ملبوس اس بوڑھیا کو مجھ جیسے اجنبی کو چھو لینے کی اجازت نہیں تھی۔ لٹھے کے چھتری نما برقعہ کے باریک سوراخوں سے جھانکتے ہوئے کون جانے اسے یہ گھناونی دنیا کیسے دکھائی پڑتی ہو گی دھیرے دھیرے نیچے تلے قدموں پر دور اچھل ہوتی ہوئی اس بوڑھیا کو میں دیر تک تکتا رہا۔
جہاں میں کھڑا تھا اس کے چند گز کے فاصلہ پر ایک چوک تھا جس کی دیوار پر بڑے بڑے حروف میں ایک کتبہ لکھا تھا "بے حجاب۔ بے وفا۔ مرگ بر بے حجاب" اور اس نوشتہ دیوار کے نیچے ایک معروف بنیاد پرست اسلامی جماعت کے دستخط ثبت تھے۔ موت اور وہ بھی اس عورت کے لئے جس کا ایک پیر پہلے ہی قبر میں تھا۔ مجھے روحانی طور پر دل میں ایک دھچکا سا لگا۔
اور یہ عورت بیچاری زندہ ہی کب تھی! جب یہ پیدا ہوئی ہو گی تو اس کے باپ نے خوشی کی تھالی ہی نہیں بجوائی ہو گی اور پھر بچپن میں بھائیوں کے بہ نسبت امتیازی سلوک پا کر کتنی ہی بار اس کا دل ٹوٹا ہو گا ____ اور جب جوانی میں کسی ایرے غیرے کے پلو باندھ دی گئی ہو گی تو زندگی میں پہلی بار اس نے رومان بھرے خواب بنے ہونگے جو ایک آدھ بچے کی پیدائش کے ساتھ ہی پارہ پارہ ہو جاتے ہیں اور اب جب وہ بوڑھی ہو کر زندہ درگور تھی تو اس کے پوتوں کی نئی نسل مذہب کے نام پر اسے موت کا مژدہ سنا رہی تھی۔ مرد کی شاونیت نے جھولے سے لے کر قبر تک عورت کا موت کی طرح پیچھا کیا ہے اور مجھے اس کے احساس پر مرد کی حیثیت میں بے حد ندامت اور شرم محسوس ہوئی۔
مجھے میری دادی یاد آئی جس نے کہتے ہیں کہ جوانی میں بیوہ ہو جانے کے بعد ہندوستان میں مرد کا کردار سنبھال کر ہمارے خاندان کی پرورش کی تھی۔ مگر بڑھاپے میں جب وہ پاکستان آئی تو اس کو تنبو نما برقعہ میں ڈھانپ دیا گیا تھا شاید اسی لئے وہ مرتے دم تک ہندوستان لوٹ جانے کے خواب دیکھتی رہی۔

سونی اکیس سال کی عمر میں تین بچیوں کی ماں بن چکی تھی۔ ایک گود میں ایک کولہے پر اور ایک انگلی تھامے۔ اس جواں سالی ہی میں جیسے وہ نچوڑ لی گئی ہو۔ بال بکھرے بکھرے۔ آنکھیں دھنسی ہوئیں اور چہرے کا رنگ روپ فق۔ چند برس کی بات ہے شادی سے قبل وہ کتنی نٹ کھٹ، کتنی سندر اور زندگی سے کتنی بھرپور تھی۔ جب وہ بولتی تو اس کے منہ سے پھول سے جھڑتے۔ جب سینہ تان کر چلتی تو اس کے پیروں میں گھونگرو سے بجتے اور جب وہ اتراتی تو مورنی کی طرح کلیلیں بھرتی۔ مگر اب دیکھتے ہی دیکھتے اس کے سر بر سے سب کس بل نکل گیا تھا۔

اس کا مرد غیر ملک میں پیسہ کمانے کی مشین بنا رہتا اور جب وہ سال میں چند دن کے لئے چھٹی پر آتا تو اسے حاملہ کر کے اس امید میں واپس لوٹ جاتا کہ اس دفعہ وہ اسے لڑکا جنم دے گی اور وہ اس لئے بھی مطمئن تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں بچے اسے جدائی یا تنہائی کے احساس کی فرصت ہی نہیں دیں گے۔ سونی کو ایک طرف تو سسرال کے طعنے سہنے پڑتے کہ وہ خاندان کو وارث دینے میں ناکام رہی ہے تو دوسری طرف مزید ناکامی کی صورت میں ٹھکرائے جانے اور سوکن کے آ جانے کا خوف اسے بچے پہ بچہ پیدا کرنے کے لئے مجبور کرتا رہتا۔ قصبہ کی ایک اور لڑکی کی مثال اس کے سامنے تھی جو پچیس سال کی عمر میں پانچ بچیوں کی ماں بن گئی تھی اور طلاق اس کا مقدر بنا۔

ہمارا قصبہ ایک اور صورت میں بھی منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ ایک تو یہ سندھ طاس کی انتہائی زرخیز زمین کا مرکز اور سندھڑی آموں کا گھر ہے۔ دوسری طرف پشاور، کراچی اور لاہور کے بعد یہ قصبہ ہیروئن کی منشیات کی تجارت کے لئے مشہور ہے۔ ایک دفعہ تو یہاں کے منشیات کے بادشاہ کا نام بی بی سی کی خبروں میں سنایا گیا اور فخر سے قصبہ کے اوباش نوجوانوں کی گردنیں تن گئیں۔

حال ہی میں قصبہ میں ایک شادی ہوئی۔ اتفاق سے دلہا منشیات کا عادی نشہ آور تھا۔ شب عروسی کے موقع پر دلہا نے اپنی کم عمر دلہن کو ہیروئن پینے کی دعوت دی۔ دلہن کے انکار پر اس نے اس بری طرح زد و کوب کیا کہ رات بھر اس کی چیخیں محلّہ والوں نے سنیں۔ مگر محلے والوں نے ان چیخوں کو دلہن کی پاک دامنی کی علامت جان کر انہیں سنجیدگی سے نہیں لیا۔ صبح ہوئی تو لوگوں نے دیکھا کہ دلہن خون میں لتھڑی بے ہوش پڑی ہے۔ اصل حقیقت کے معلوم ہونے پر دلہن کے والدین نے اس کو گھر واپس لے جانے اور طلاق لینے کی دھمکی دی۔ اس اثنا میں جب لڑکی کو ہوش آیا اور جب اس نے طلاق کا ماجرہ

سنا تو وہ چیخ چیخ کر فریاد کرنے لگی۔ "نہیں، نہیں مجھے طلاق نہیں چاہیے۔ میں گھر واپس نہیں جاؤں گی۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔" شاید اس لئے بھی کہ پہلی رات کی طلاق شدہ لڑکی کے لئے تو والدین کا گھر جہنم سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔

قصبہ کے نچلے درمیانہ طبقہ کی گھناؤنی زندگی سے تنگ آ کر میں اکثر دیہاتوں کا رخ کرتا جہاں میں سمجھتا تھا کہ انسان فطرت کے زیادہ قریب رہتا ہے۔ ایک دن میں ایک گوٹھ جا رہا تھا تو ایک عجیب نظارے نے میرا سواگت کیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ گھاس سے بھری ایک بیل گاڑی نہر کی پٹڑی کے ساتھ آہستہ آہستہ رواں ہے اور چہرے پر بڑا سا گھونگھٹ ڈالے ایک بھیل عورت اسے ہانک رہی ہے۔ ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیوں اور کھائی کھڈوں کو عبور کرتی ہوئی اور پھر نہر کی پتلی سی پگڈنڈی پر پورے طور پر گھونگھٹ میں ڈھکی یہ عورت بیل گاڑی کی سیدھ کو کیسے قائم رکھے ہوئے تھی میں دیر تک حیرانی سے کھڑا اسے دیکھتا رہا۔

گوٹھ کے قریب پہنچا تو جھاڑیوں میں جینی شام کا کھانا پکانے کے لئے ایندھن کے طور پر سوکھی لکڑیاں اور گوبر چن رہی تھی۔ وہ کوئی آٹھ سال کی کومل بدن ہاری لڑکی تھی۔ مجھے دور سے آتا دیکھ کر وہ دوڑتی ہوئی میری طرف آئی اور خوشی سے مسکراتے ہوئے سندھی رسم میں اپنا ننھا ہاتھ میری طرف سلام کے لئے بڑھایا۔ پھر انتہائی نرم اور قربتی لہجے میں میری خیریت پوچھنے لگی کہ میں اتنا عرصہ کہاں تھا اور کیسا تھا۔

سانولی، نرم گفتار اور موہنی صورت سی اس دیہاتی لڑکی کے گوبر چگنے کے انداز میں ایک بیلے ناچنے والی لڑکی کی سی دلکشی تھی۔ مگر اس سب کچھ کے باوجود جینی کی سیاہ چمکتی آنکھوں میں ایک گہری گھمبیرتا کی جھلک تھی جو عموماً اتنی کم سن لڑکی کا شیوہ نہیں ہوتا۔ جینی کا والد یومیہ دیہاڑی کمانے والا کھیت مزدور تھا جو اکثر گھر سے باہر رہتا۔ جینی کی بڑی بہن کی شادی اس کی برادری کے ایک چرواہے سے ہوئی تھی۔ جینی اپنی ماں کے سائے تلے رہتی تھی۔ حال ہی میں اس کے بہنوئی نے ناراضگی کی صورت میں جینی کی بڑی بہن کو گھر بھیج دیا تھا کیونکہ وہ دوسری شادی کرنا چاہتا تھا۔ جس پر جینی کی بہن راضی نہیں تھی اور جینی کی ماں نے بھی داماد کی اس حرکت پر برا منایا تھا۔

اس واقعہ کے چند روز بعد ایک رات کو جینی کا بہنوئی اپنے ایک ساتھی کے ساتھ اس کے گھر آیا جہاں جینی کی ماں اور اس کی بڑی بہن آنگن میں کھلے آسمان تلے سو رہی تھیں۔ دونوں مردوں نے آدھی رات پڑے سوئی ہوئی عورتوں پر بے دردی سے کلہاڑیاں برسانی شروع کر دیں۔ جینی جو قریب ہی سوئی ہوئی تھی ماں اور بہن کی خوفناک چیخیں سن کر

پاس کی جھاڑیوں میں جا چھپی۔ عورتوں کی چیخیں سن کر جب گاؤں کے تھکے ہارے کسان گہری نیند سے چونکے اور وہاں پہنچے تو جینی کی ماں دم توڑ چکی تھی اور اس کی بڑی بہن خون میں لت پت پڑی تھی۔

اگلی صبح جب ببر کے بڑے سے سایہ دار درخت کی شاخوں کے بیچ سے مشرقی سورج نے اپنی سنہری کرنیں ہر طرف بکھیر دیں تو جینی کی چمکتی ہوئی آنکھوں کی روشنی ہمیشہ کے لئے ایک غم ناک اندھیرے میں ڈوب چکی تھی۔

میں اس سفر میں جینی کے لئے کپڑوں کا ایک جوڑا لایا تھا جو میں نے اپنے سفری تھیلے سے نکال کر اسے تھما دیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ جیسے کپڑوں کو دیکھ کر لمحہ بھر کے لئے جینی کی آنکھوں میں چمک لوٹ آئی۔ اس نے اپنے مخصوص معصومانہ دیہاتی انداز میں پل بھر کے لئے مسکرانے کی کوشش کی اور اس کے فوراً بعد مجھے اس کی آنکھوں میں وہی غم ناک خلاء نظر آیا۔

ہمارے پاکستانی معاشرہ میں عورتوں کو داغ دینا۔ اندھا کر دینا ناک کاٹ لینا۔ ہوس کا نشانہ بنانا اور مرد کے بدلے میں بے دردی سے قتل کر دینا معمول بن گیا ہے۔ بیشتر حالات میں یہ عورتیں بے قصور اور بے بس ہوتی ہیں اور موت یا درد ناک زندگی کے سامنے بے زبان جانور کی طرح گردن جھکا دیتی ہیں۔

والدین، سسرال، قانون، ملا اور غیرت کے نام پر جاگیردارانہ یا قبائلی معاشرہ عورت کے خلاف مرد کے ان بھیانک جرائم میں برابر کے شریک ہیں۔

زیست کے دھندلکے میں

قدیم تاریخ شاہد ہے کہ کانسے کے ابتدائی دور میں عورت کو قبیلے میں عزت و احترام کا اعلیٰ مقام حاصل تھا۔ اس زمانہ میں انسانی تخلیق کی سب سے برتر دیوی کے طور پر "ماتا" کی پوجا کا رواج دنیا بھر میں تھا اور شاید انسانی تاریخ کا یہی دور نسبتاً پرامن اور تخلیقی اقدار کا حامل تھا۔ گھر کی سربراہ کے طور پر ماں لڑکے اور لڑکیوں میں امتیاز برتنے کی قائل نہیں تھی اور خاندان کے افراد گھر میں جو کچھ ہوتا مل بانٹ کر کھا پی لیتے۔ اگر ماں کسی بچے کو ترجیح دیتی بھی تو وہ اکثر کمزور ترین اور غیر محفوظ بچہ ہوتا۔ ماں کی صورت میں عورت کی اعلیٰ خصلتیں آج بھی بدرجہ اتم موجود ہیں۔ غرضیکہ مادرانہ نظام' ذاتی ملکیت اور طبقات کی تفریق سے نسبتاً آزاد تھا اور اسی لئے پرامن بھی تھا۔ اس دور کو قدیم اشتراکیت کا دور بھی کہا جاتا ہے۔

پرامن بقائے باہمی میں بڑا فرق اس وقت پڑا جب آریاؤں نے برتری حاصل کر کے پدرانہ سماج کی بنیاد ڈالی اور تب سے عورت کی ناک میں نتھ' آنکھوں پر پردہ اور ہاتھ پیروں میں سونے اور چاندی کی بیڑیاں ڈال کر اسے غلام بنا لیا گیا۔ نہ صرف غلام بلکہ اسے غلاموں کی کھیپ پیدا کرنے کی مشین میں منتقل کر دیا گیا اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ اسے چادر میں لپیٹ کر چار دیواری میں زندہ درگور کر دیا گیا۔ آریاؤں کی نسلی برتری کے نتیجہ میں مرد کی انا پرستی' لالچ' اقتصادی لوٹ کھسوٹ چوری اور سینہ زوری پدرانہ نظام کی نئی اقدار قرار پائیں۔ تب سے سماج قبیلوں' ذات پات اور طبقات کی لعنتوں میں بٹتا چلا گیا اور انسانی مزاج میں نفرت اور حسد کا جذبہ پریم اور بھائی چارے پر حاوی ہوتا چلا گیا۔

پدرانہ نظام میں پدر "باپ اور پجاری (ملا) سماجی جبر اور شخصی آمریت کے طور پر دو اہم ستون بن کر ابھرے۔ غلامی کے دور کے خاتمہ پر جب جاگیردارانہ نظام کی ڈاغ بیل پڑی تو خاندانی غیرت اور مذہبی جنون کے ذریعہ مرد کی شاونیت کا دفاع کیا گیا جو ترقی پذیر ملکوں میں آج تک قائم ہے۔

اس مختصر تاریخی پس منظر کی روشنی میں پاکستان میں ضیاء کی فوجی آمریت کے دوران

عورتوں کے ساتھ جو امتیازی سلوک روا رکھا گیا اسے سمجھنا مشکل نہیں۔

کانسے کے دور میں دراوڑی مادرانہ نظام اور اس کے علامتی شہر موہن جودڑو اور ہڑپہ کے غرق ہونے اور پھر بیسویں صدی میں پھر سے ظاہر ہونے تک دریائے سندھ کا بہاؤ کتنے ہی رخ بدل چکا ہے۔ آریاؤں کے نقش قدم پر کتنے ہی جابر حملہ آور قبائل نے ہند و پاک کی خاک پر خون سے ہولی کھیلی۔

اور پھر جیسے کرشماتی طور پر موہن جودڑو کے ظہور کی طرح پاکستان کی عورتوں نے بھی ضیاء کے دور میں اپنی ہزاروں سالہ سماجی غلامی کی راکھ سے اٹھ کر اپنے احیاء اور آزادی کی تحریکوں کو پھر سے جنم دیا۔ ظاہر ہے اس کی کرسی کو خطرہ لاحق ہوا۔ سرتاج گھبرا گئے اور مقدس باپ بوکھلا اٹھے۔ آقا کے حکم پر مقدس باپ نے عورتوں کے خلاف' شریعت بل اور نویں ترمیم' جیسے حربوں سے عورتوں کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا تاکہ ان کو بقول ان کے حدود میں رکھا جا سکتا۔ اس موقع پر کسی نے خوب کہا کہ اللہ کی تخلیق کے خلاف ملا کی قوت تو ہمیشہ ہی نبرد آزما رہی ہے۔ گو کہ جاگیردار فوج کی مدد سے ابھی تک تو پلا ملا ہی کا بھاری ہے۔ اس وقت یہ کون کہہ سکتا تھا کہ پاکستان میں اس کا پایہ موہن جودڑو کے قریب کے شہر میں پیدا ہونے والی کومل سی لڑکی پہلے اسلامی ملک کی خاتون وزیراعظم بن کر پلٹنے والی تھی۔ بے نظیر بھٹو اس سعی میں خواہ کتنی ہی ناکام کیوں نہ رہے مگر پاکستان کی جدید عورت کی تاریخ میں وہ ایک سنگ میل ضرور ثابت ہو گی۔

مگر دیہات کی عورت ابھی اتنی خوش نصیب نہیں ہے۔ سندھ کی زرعی پیداواری محنت کا کوئی ساٹھ فیصد بوجھ ابھی عورت کے ناتواں کندھوں ہی پر ہے۔ محض زندہ رہنے کی خاطر وہ دن رات کولھو کے بیل کی طرح محنت کی چکی میں پستی رہتی ہے۔ موجودہ جاگیرداری نظام کے پیداواری رشتوں میں عورتوں اور بچوں کا کردار ناگزیر ہے۔ گندم اور گنے کی کٹائی اور چھلائی' چاول' مرچ اور پیاز کی بوائی' کپاس اور مرچوں کی چونٹائی و دیگر سبزیوں کی بوائی' گڈائی یا کھدائی محض عورتوں کے بل بوتے پر قائم ہے۔

اگر یہ صحیح ہے تو کوئی ملا سے پوچھے جو اپنی گزران کے لئے کبھی محنت نہیں کرتا کہ عورتوں کو پابند سلاسل کر کے وہ کس کی خدمت انجام دے رہا ہے۔

"سٹار" پندرہواڑے کالم کے لئے جب میں یہ سطور لکھ رہا تھا تو کپاس کی چونٹائی اور پیاز کی بوائی کا موسم تھا اور اگر آپ کو اس موسم میں اندرون سندھ کے دیہات میں سفر کرنے کا اتفاق ہوا ہو تو آپ کو تاحد نظر عورتوں کے غول کے غول کپاس چونٹتے یا پیاز

بوتے نظر آئیں گے۔ جن کی اکثریت نچلی ذاتوں کے ہندوؤں کی ہے۔ کڑکتی دھوپ میں قطار در قطار لگن کے ساتھ کام میں جتی جب یہ عورتیں اپنے رنگین اور بھڑکیلے لباسوں میں پودوں کے گرد جھوم جھوم کر کپاس چونٹتی ہیں تو ان کی انگلیاں تتلیوں کی مانند پھڑپھڑاتی نظر آتی ہیں۔

نظم و ضبط اور پابندی کے ساتھ چیونٹیوں کی طرح رینگتی یہ عورتیں دن بھر محنت کرتی ہیں تاکہ سردیاں آنے سے پہلے اپنے بال بچوں کے لئے کچھ فاضل غلہ اکٹھا کر سکیں۔ شام پڑے تھکی ہاری یہ عورتیں گھروں کو لوٹتی ہیں تو ان کے انگ انگ میں درد، سر میں چکر اور انگلیوں سے خون رستا ہے۔ وہ جو دن بھر میں بیس سے تیس کلو کپاس چونٹ پائیں تو معاوضہ کے طور پر صرف دس سے پندرہ روپے کما پاتی ہیں۔ بیشتر عورتیں اس سے آدھا بھی نہیں کما پاتیں کیونکہ انہیں گھر کے دوسرے کام کاج بھی کرنے پڑتے ہیں اور کچھ ایسی بدنصیب بھی ہوتی ہیں جن کے اس حالت میں گھر پہنچنے پر ان کے ناکارہ مرد ان کی یہ پونجی بھی چھین لیتے ہیں۔

عموماً عورتیں منہ اندھیرے اٹھتی ہیں۔ گائے بھینسوں کا دودھ نکالتی ہیں۔ دہی بلوتی ہیں۔ روٹی پکاتی ہیں اور پھر گھر کی صفائی کر کے کھیتوں کا رخ کرتی ہیں۔ اگر سب سے چھوٹا بچہ پیٹ میں نہ ہو تو کولہے پر ہوتا ہے۔ کام میں جٹنے سے قبل وہ جھاڑیوں کے بیچ کپڑے کا جھولا ڈال کر بچے کو جھلا دیتی ہیں۔ اگر وہ ذرا بڑا ہو تو جھاڑیوں میں کھیلنے کے لئے چھوڑ دیتی ہیں اور پھر وہ ایک دوسرے کا دل بہلاتی۔ دکھڑے سناتی اور اکثر آنسو بہاتی وہ اس ناخوشگوار اور بے کیف کام میں جتی رہتی ہیں۔

جوان اور خوش شکل لڑکی کو اکثر بڑھیا ماں کی نگہداشت یا چھوٹے بھائی کی نگہبانی میں رکھا جاتا ہے تاکہ سایوں کی طرح گردونواح میں گھومتے زمیندار یا اس کے کامدار کی بد نظروں سے بچایا جا سکے۔ کبھی کبھی وہ لاکھ احتیاط کے باوجود ان کی بیجا دست درازیوں اور نتیجہ کے طور پر بدنامی سے نہیں بچ پاتیں۔ ایسی لڑکیاں یا تو اونے پونے فوراً بیاہ دی جاتی ہیں اور کبھی کبھی غیرت کے نام پر قتل بھی کر دی جاتی ہیں۔

گھر لوٹنے سے پہلے ان کو جانوروں کے لئے گھاس کاٹنی پڑتی ہے اور شام ڈھلے سر پر گھاس کا گٹھا اور کولہے پر بچہ اٹھائے پتلی پگڈنڈیوں پر بوجھل قدموں کے ساتھ جب وہ ٹھمک کر چلتی ہیں تو ان پر ناچنے والی فنکاروں کا گمان ہوتا ہے۔

گھر پہنچنے پر رات کی چکی کا پاٹ شروع ہو جاتا ہے۔ نزدیک کی نہر یا کھال سے پانی کے

گھڑے بھرتی ہیں۔ گائے بھینسوں اور بکریوں کا دودھ نکالتی ہیں۔ کھانا پکاتی ہیں۔ اس دوران گود کا بچہ یا تو بلکتا رہتا ہے یا چھاتی سے سے چپٹا اس کے جسم کی طاقت کا آخری قطرہ تک نچوڑ رہا ہوتا ہے۔ تاروں بھری پراسرار اندھیری رات دیہات کی ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے اور اس کی بقیہ رات مرد کی جنسی خواہشات' بچے کی حفاظت اور چوروں کے خلاف جانوروں کی رکھوالی کی نظر ہو جاتی ہے۔

غرضیکہ غریب کسان عورتوں کی غلامانہ' بدمزہ خشک اور بے مقصد زندگی کا پہیہ محض ناامیدی سے بھرپور وجود کی خاطر دن اور رات چلتا ہی رہتا ہے اور موجودہ سیاسی اور سماجی جمود کو دیکھ کر تو یوں لگتا ہے جیسے ابھی صدیوں تک چلتا ہی رہے گا۔

بیوی بیگم

میں نے ایک دفعہ کراچی کی ایک خوش حال بستی میں ایک خوش لباس۔ خوش شکل اور خوش مزاج خاتون کو بہت سلیقے کے ساتھ ایک ڈیپارٹمینٹل سٹور چلاتے دیکھا۔ اس کی نرم گفتار اور مہذب لب و لہجے سے صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ کسی پڑھے لکھے خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ بظاہر وہ ایک کامیاب دکاندار نظر آتی تھی مگر نہ جانے کیوں وہ اپنی آنکھیں ہر وقت کالے چشموں کے پیچھے چھپائے رکھتی جیسے کہ وہ نظریں چورانا چاہتی ہو۔

"ہاں!" اس نے کہا۔ "میری زندگی ایک طویل اندھیری اور بری رات کی مانند ہے اور پھر کالا چشمہ آنکھوں سے اتار کر میری طرف سنجیدگی کے ساتھ دیکھا ____ اس کی ہلکی بھوری اداس آنکھوں کے گرد ہالے پڑے ہوئے تھے۔ اور وہ ہلکی سی اندر کو دھنسی ہوئی تھیں جیسے ان کے اندر کوئی بھیانک داستان دفن ہو۔ میں اس کا خاندانی دوست ہونے کے حوالے سے یہ جانتا تھا کہ وہ غیر ملک میں پیدا ہوئی تھی اور اس کی زندگی میں بڑی تبدیلی اس وقت آئی وہ اپنی جڑوں کی تلاش میں اعلیٰ تعلیم کے لئے پاکستان پہونچی اور لاہور کے ایک مشہور کالج میں داخلہ لے لیا اور پھر جیسے پاکستان کی فلموں میں ہوتا آیا ہے اسے ایک پرنس چارمنگ مل گیا اور اس کی شادی ہو گئی جو کہ اس کی زندگی کا سب سے خوفناک تجربہ ثابت ہوا۔

اس دفعہ جب میں اس سے ملا تو میں نے تہیہ کیا کہ اس کے دل کا راز ضرور اگلواؤنگا۔ جو حقیقت میں خاوند کی سنگ دلی اور بیوی کی مظلومیت کی ایسی داستان تھی جو ہمارے معاشرے میں رواج کی حیثیت رکھتی ہے۔ "ہاں؟ تو یہ سب کچھ کیسے شروع ہوا؟" جب میں نے پوچھا تو وہ بولنا شروع ہوئی۔

"یہ غالباً سن ساٹھ کی دہائی کی بات ہے۔ میں نے افریقہ سے آکر ایک پیشہ ورانہ کالج کے پہلے سال میں داخلہ لیا۔ جب میں پہلی بار اس سے ملی تو میں بمشکل سترہ سال کی تھی۔ اس سے پہلے میں نے بہت محفوظ زندگی گزاری تھی لہٰذا دنیا داری کے معاملات میں مجھے کوئی خاص تجربہ نہ تھا۔ میرے اجداد کسی زمانے میں پنجاب سے اٹھ کر محنت مزدوری کرنے

افریقہ چلے گئے تھے اور پھر دیگر ہندوستانیوں کی طرح بہت خوش حال ہو گئے۔ چونکہ افریقہ میں ہماری تربیت ہندوستانی ماحول میں ہوئی تھی اس لئے وطن کے طور پر پنجاب کو لوٹنا میرے لئے خواب سے کم نہ تھا۔ اس زمانہ میں زندگی کو میں نے ایک جیالے رومانس اور میٹھے خواب سے زیادہ اہمیت نہ دی تھی۔ یوں بھی ثقافتی طور پر افریقہ میں میری نشوونما بہت آزاد خیال ماحول میں ہوئی تھی اور پاکستان کے ماحول کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ خاص طور پر یہاں کے نودولتیہ طبقہ کے بارے میں تو بالکل ہی کوری تھی اور اس طرح میں بہت آسانی کے ساتھ اس کے دام میں پھنس گئی۔"

"کیا مطلب دام میں پھنس گئی۔ کیا وہ شکاری تھا؟ ___" میں نے بات بڑھانے کے لئے لقمہ دیا۔

"مطلب تو تم خود ہی نکال لو۔ مگر شادی سے پہلے اس نے بڑے بڑے سبز باغ دکھائے تھے۔ کتنے ہی وعدے وعید کئے تھے اور میرے ایک اقرار یا انکار پر سر تن سے جدا کر کے میرے چرنوں میں بھینٹ چڑھانے کا دعویٰ بھی کیا تھا۔ مگر یہ راز تو شادی کے بعد کھلا کہ وہ سر بھی حقیقت میں میرا ہی تھا جو اس نے دھڑ سے الگ کرنے کا واعدہ کیا تھا۔ مگر جب تک اس نے اپنا اصل رنگ دکھلایا تب تک میں ایک بیوقوف پنچھی کی طرح اس کے بچھائے ہوئے جال میں پوری طرح جکڑی جا چکی تھی۔ اس نے میرا کالج چھڑوا دیا اور گھریلو بیوی بنا کر برقعہ پہننے پر مجبور کیا جو میری اماں بلکہ دادی بھی چھوڑ چکی تھیں۔ اس نے میری جملہ زندگی کا اس طرح احاطہ کیا کہ جیسے میں انسان نہیں بلکہ اس کے کھونٹے سے بندھا جانور تھی۔ میں تنہا بازار بھی نہیں جا سکتی تھی اور جب وہ مجھے ساتھ لے کر جاتا تو مجھ سے چند قدم آگے اصیل مرغے کی طرح اکڑ کر چلتا اور میں برقعہ میں محبوس دبی دبی سی اس کے پیچھے یوں چلتی جیسے وہ مداری تھا اور میں اس کی ڈگڈگی پر قدم دھرتا ہوا بھالو۔ وہ ہر چیز مجھ پر ٹھونستا خواہ مجھے پسند ہوتی یا نہ ہوتی۔ میں اپنی مرضی کے کپڑے۔ جوتے غرضیکہ چوڑیاں تک بھی نہیں خرید سکتی تھی اور جلد ہی مجھے احساس ہونے لگا کہ اس کی زندگی میں میری حیثیت ایک داشتہ سے مختلف نہیں اور جس کا کام محض اس کی جنسی ضروریات کے ساتھ ساتھ گھر بار کا دھندا چلانا تھا۔

"تو تم نے اپنے والدین کی مدد لینے کی کوشش نہیں کی؟" میں نے پوچھا "یہی تو میری سب سے بڑی کمزوری تھی۔ میں نے والدین سے چوری چوری شادی کی تھی۔ کیونکہ مجھے پتہ تھا کہ میرے والدین اس پر کبھی راضی نہ ہونگے اور وہ اب اس کا خوب فائدہ اٹھا رہا

تھا۔"

وہ بہت ہی خود غرض آدمی تھا۔ جب اس کی اپنی ضرورت ہوتی تو وہ سیکولر، جمہور پسند بلکہ ترقی پسندی کا دم بھی بھرتا۔ مگر جب میرے مفاد کی بات آتی تو وہ تنگ نظر فرقہ پرست، قبائلی اور رجعت پسند ذہنیت کا مظاہرہ کرتا۔ وہ بہت ہی بڑا منافق اور دوغلا انسان تھا۔ مردانہ شاونیت اس میں تشدد کی حد تک کوٹ کوٹ کر بھری تھی اور کبھی کبھی اس کا مظاہرہ بھی کرتا تاکہ میں اپنے آپے سے باہر نکلنے کا نہ سوچوں۔ شادی سے پہلے اس نے اپنا اصل چہرہ بہت چالاکی کے ساتھ چھپائے رکھا۔ شروع شروع میں تو مجھے یقین ہی نہیں آیا کہ کوئی انسان اس حد تک مکار بھی ہو سکتا ہے۔ میں اب تک یہی سمجھتی رہی کہ یہ سب کچھ میرے سسرال والوں کا کیا دھرا ہے۔ میں نے اسے قسمت کا کھیل سمجھ کر اپنے اندر کے خول میں پناہ لے لی اور ایک طویل عرصہ تک چپ سادھے زندگی کی یہ کڑوی گھونٹ زہر مار کرتی رہی۔ کوئی ایک دہائی یوں ہی گزر گئی۔ اس دوران میری جلی ہوئی کوکھ سے تین بچے بھی پیدا ہوئے۔

اس کے کچھ عرصہ بعد میرے میاں کا تبادلہ کراچی ہو گیا۔ میرے دل میں امید کی ایک کرن پیدا ہوئی کہ اب سسرال والوں سے دور حالات اچھے ہو جائیں گے۔ مگر یہ بھی میری خوش فہمی ہی نکلی۔ گو وقت کے ساتھ ساتھ ہمارے معاشی حالات سدھرتے گئے مگر ہمارے سماجی حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔

پھر یاس اور ناامیدی کی گھٹاؤں نے میرے ذہن کو ہر سو گھیر لیا۔ زندگی اژدھے کی طرح منہ کھولے ہر چیز کو چاٹتی نظر آئی۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ یہ دنیا ایک اندھیری اور خوفناک غار ہے اور اس کے دوسری طرف روشنی کا نشان تک نہیں۔ اب میں بچوں کو چھوڑ کر بھاگ بھی نہیں سکتی تھی۔ میں اندر ہی اندر ٹوٹ کر بکھرنے لگی۔ چھوٹی چھوٹی چیزیں پہاڑ بن کر سامنے آنے لگیں اور مجھ میں اب زندگی کا مقابلہ کرنے کی تاب نہ رہی۔ تب میں نے نشہ آور گولیاں کھانی شروع کر دیں۔ یہاں تک کہ میں ان کی عادی ہو گئی۔ زندگی کو کچھ عرصہ اسی طرح دھکیلتے رہنے کے بعد مجھے محسوس ہونے لگا کہ جیسے میری تمام تر توانائیاں پگھل کر میرے جسم سے بہتی جا رہی ہیں اور یہ کہ آہستہ آہستہ اب میں موت کی منہ میں رواں ہوں۔ میں نشہ کی حالت میں گھنٹوں ساکت و جامد بیٹھی دیواروں کی طرف خلاء میں گھورتی رہتی۔ اب میں پاگل ہونے کے قریب تر پہنچ چکی تھی ____ ایک دن بچوں کے مستقبل کے خیال نے اچانک مجھے جھنجھوڑ کر جیسے گہری نیند سے جگا دیا۔ بچوں کا

کیا بنے گا؟ اب یہ خیال بھوت کی طرح میرے سر پر سوار ہو گیا۔
"اور پھر نہ جانے کہاں سے یک لخت میں نے اپنے اندر ایک پراسرار سی قوت محسوس کی اور یکلخت نشہ آور گولیاں کھانی ترک کر دیں اور میں نے فیصلہ کیا کہ اب میں اپنے لئے نہ سہی پر بچوں کے مستقبل اور ان کے حقوق کے لئے نہ صرف جیوں گی بلکہ لڑوں گی۔ میری بڑی بیٹی اب جوان ہو رہی تھی اور اس نے اب مجھے سہارا دینا شروع کر دیا تھا۔ اس نئے شعور سے حوصلہ پا کر میں نے اپنے آپ کو سنبھالا دیا اور عزم کیا کہ اب میں بھی ایک آزاد انسان ہوں اور اس کے بعد میں نے غلامانہ زندگی قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔
"اچھا! تو تمہارے خاوند کا رد عمل کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔
"رد عمل؟" وہ جو میری مکمل تابعداری اور جی حضوری کا عادی تھا اور جس نے کبھی میرے منہ سے نہ کا لفظ تک نہیں سنا تھا غصہ میں پاگل ہو گیا۔ اب وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر مشتعل ہونے لگا اور بچوں کے سامنے گالی گفتار و نیز تشدد کا مظاہرہ کرنے لگا۔ اب چونکہ میں بھی ترکی بہ ترکی جواب دینے لگی تھی تو وہ پڑوسیوں اور نوکر چاکروں کے سامنے مجھ پر بدکرداری کا کھلا الزام اور نت نئے بہتان لگانے لگا۔
"کمال ہے! تمہارے والدین نے اس عرصہ تمہاری کوئی خبر نہیں لی؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔
"ہاں بڑی عجیب بات ہے" اس نے بتلانا شروع کیا۔ "میرے والد کا اس عرصہ میں انتقال ہو گیا تھا۔ مگر میری ماں اس عرصہ میں کئی دفعہ آئی۔ مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ ہر دفعہ اُس نے اس کی ہی حمایت کی۔ بلکہ اس کے ساتھ گٹھ جوڑ سا کر لیا۔ رہ سہہ کر ایک بھائی رہ گیا تھا جو اب پاکستان ہی میں تھا۔ مگر نہ اس نے میری شادی قبول کی تھی اور نہ ہی کبھی ملنے یا ہمدردی جتلانے آیا تھا۔ میں تنہا کی تنہا ہی رہی۔" وہ تھوڑی دیر سانس لے کر پھر بولنا شروع ہوئی۔
"ایک دن اس نے ذرا سی بات پر الجھ کر میرے کانوں پر اس زور کا مکا مارا کہ میں بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑی اور جب مجھے ہوش آیا تو میں نے بچوں سمیت بھاگ کر ایک رشتہ دار کے گھر پناہ لی۔ اس زمانہ میں وہ جنون سے اس قدر پاگل ہو گیا تھا کہ اس کی نوکری بھی جاتی رہی اور نوکری کھو دینے کے بعد اس میں کچھ تبدیلی آئی اور اس نے بیوپار کرنے کی غرض سے مجھ سے مصالحت کرنی چاہی تاکہ میری مدد لے۔ بچوں کے مستقبل کا

خیال کر کے میں بھی چارو ناچار اس کی تحویل میں لوٹ آئی۔ مگر ابھی کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ وہ پھر کینہ پروری پر اتر آیا اور ایک دفعہ پھر انتقام کی آگ میں جلنے لگا۔ اس نے اب نہ صرف میرے گھر سے باہر جانے پر پابندی لگا دی بلکہ میری سہیلیوں کا بھی گھر میں داخلہ بند کر دیا۔ دوسری طرف گھر کا خرچ بھی گھٹا کر آدھا کر دیا اور ایک دفعہ پھر میں اپنے ہی گھر میں یرغمال بن کر رہ گئی۔

جب میں نے طلاق لینے کی بات کی تو اس نے صاف انکار کر دیا اور پھر قرآن اور سنت کی رو سے خاوند کے حقوق گنوانے شروع کر دیئے۔ مگر کبھی کبھی وہ مجھے بلاطلاق دیئے بے سروسامان گھر سے باہر پھینک دینے کی دھمکی دیتا رہا۔ مجھے اب یہ احساس ستانے لگا کہ میں اس کے ٹکڑوں پر پلنے والی بھکارن ہوں۔ اس دوران اس کی نوکری پھر سے بحال ہو گئی اور وہ اپنے بے ترتیب اور بگڑے ہوئے بیوپار کو میرے کندھوں پر ڈال کر پھر سے نوکری کرنے لگا اور اس طرح میں اپنے اور بچوں کے تحفظ کے لئے یہ دکان چلا رہی ہوں جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو۔

مگر میں ہر وقت نہایت بے یقینی اور خوف کی فضا میں زندگی گزار رہی ہوں کہ نہ جانے وہ کس لمحہ مجھے مکمل طور پر تباہ کرنے کے لئے کیا قدم اٹھائے۔ وہ میرا خاوند ہی نہیں بلکہ آستین کا سانپ ہے اور میں رات بھر اس کے پہلو میں بستر پر پڑی جاگتی رہتی ہوں کہ نہ جانے کس وقت ڈس لے۔ ہمارے درمیان نفرت اور بے ایمانی کی دیواریں کھچ گئی ہیں جنہیں اب ہم کبھی عبور نہیں کر سکتے۔ میرا ذہن تو اب بھی باغی سہی مگر میرا جسم اب بھی شادی کے قانونی بلیک میل کے ذریعہ اس کی ذاتی ملکیت ہے۔

ہاں! میں نے ایک طویل عرصہ سے روشنی نہیں دیکھی ہے" یہ کہہ کر اس نے اپنا کالا چشمہ پھر سے آنکھوں پر لگا لیا اور اپنے اندرونی خول میں واپس لوٹ کر خاموش ہو گئی!" "اگر تم چاہو تو میں تمہاری داستان کو اپنے کالم میں لکھ دوں میں نے اس سے اجازت چاہی؟"

"اجازت! اگر تم ایسا کر دو تو غم جاناں غم دوراں میں بدل جائیں گے۔ میرا دل کا کچھ بوجھ ہلکا ہو جائے گا اور میں سمجھوں گی کہ انسانیت ابھی پوری طرح مردہ نہیں ہوئی۔ تمہیں قسم ہے تم یہ سب کچھ ضرور لکھنا ____" اس نے موہوم سی فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ مجھ سے التجا کی ____

گریجویٹ ہاری

"پرچن شال پنوار
ڈھولا مارو۔ موں ساں
پرچن شال پنوار"

(میرے محبوب مارو پنوار جو مجھ سے روٹھ گئے ہیں۔ ایک دن ضرور لوٹ آئیں گے۔)

شاہ لطیف کی بیت کے میٹھے سر میں عابدہ پروین کی کوئل کی طرح کوکتی آواز دور کہیں پاتال سے آتی سنائی دی۔ جس سے سندھی دیہات کا ماحول مزید پراسرار ہو گیا تھا۔ جوں ہی ہم ایک زمردی کھیت کو عبور کر کے اس کی دوسری طرف آئے تو دیکھا کہ ایک کسان ہل سے جتا بیلوں کے پیچھے گھسٹتا جا رہا ہے۔ وہ لمحہ بھر کے لئے سنبھلا اور کبھی کبھی چلا کر بیلوں کے سر پر سوٹی ہلاتے ہوئے ایک موٹی سی فحش گالی دی اور دم ہلا کر جیسے ہی بیل کچھ تیز ہوئے تو اس نے یکلخت کسی فطری جذبے کے تحت اونچی آواز میں ایک میٹھا سا سر نکالا جو آکاش میں پھیل کر ہمارے کانوں سے آ ٹکرایا۔

"اتے ہی آہین _ جتھے اہواں چھڈیوں
انکھیوں عبداللطیف چئے _ ماگ نہ مٹائیں۔"

مبہوت آنکھیں وہیں ساکت ہیں
جہاں محبوب نے چھوڑا تھا
عبداللطیف کہتا ہے کہ
میری آنکھیں وفا کی پتلیاں ہیں ــــــ

"کون ہے یہ؟" میں نے اپنے ساتھی سے پوچھا۔ "اس کی میٹھی آواز سے یوں لگتا ہے جیسے اس کی روح میں کوئی کانٹا چبھا ہوا ہو۔"

"یہ پاس کی گوٹھ کا نوجوان کسان ہے۔ قبیلے کا پنوھور ہے۔ اس نے بی۔ اے کی تعلیم حاصل کی ہے۔ مگر نوکری نہ ملنے کی صورت میں ہل چلا کر بال بچوں کا پیٹ پالتا ہے۔" میرے دوست نے گھمبیر آواز میں جواب دیا۔

اتنے میں ہم اس کے قریب پہنچ چکے تھے۔ اس نے ہمیں قریب آتا دیکھ کر بیلوں کو روکا اور ہل سے جدا کر کے قریب کے ببر کے درخت کے ساتھ باندھا اور پھر دھیرے دھیرے جھومتا ہمارے پاس آیا اور بغلگیر ہوا۔ وہ طویل قامت، چوڑا چکلا کوئی بیس کی دہائی میں اترتا خوش شکل نوجوان تھا۔ تیز ہوا میں اڑتے گھنے سیاہ بالوں نے اس کے سانولے حسین چہرے کو مزید جاذب بنا دیا تھا۔ اس کی چمکیلی سیاہ آنکھوں میں تڑپ تھی۔ ناک ستواں موٹے ہونٹ اور جب وہ ہمیں علیک سلیک کر کے مسکرایا تو خلوص اور پیار اس کے انگ انگ سے چھلکتا نظر آیا۔ ایک اچٹتی سی نظر ڈالنے پر وہ کسی بھولے بسرے ماضی کی دنیا کا کوئی گم شدہ سورما دکھائی پڑا۔ اس کا نام محمد صدیق پنھور تھا۔

"یہ پنھور کون لوگ ہیں صدیق؟" میں نے مانوسیت کے ساتھ اس سے پوچھا۔ "کیا یہ وہی لوگ ہیں جن میں ماروی پیدا ہوئی اور جن کے گیت شاہ لطیف نے گائے ہیں؟"

سورٹھ مارو اس ریگستانی علاقے کو کہا جاتا ہے جو راجستھان۔ کچھ بھوج اور گجرات کے علاقہ سے ملحقہ ہے۔ وہاں کے بسنے والے قبیلے جن میں پنھور چوہان۔ کولھی اور بھیل سبھی شامل ہیں مارو کہلاتے ہیں۔ اور اس علاقہ کو مارواڑ بھی کہا جاتا ہے۔ ماروی انہی قبائل کی کوئی لڑکی تھی غالباً پنھور قوم کی تھی جسے عمر سومرا اٹھا لایا تھا۔ ویسے یہ لوک کتھا ہے اور اس سے زیادہ مجھے بھی کچھ معلوم نہیں۔ مگر سندھ میں پنھوروں کی تاریخ خاصی دلچسپ ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ہم اپنے آپ کو پنھور راجپوت کہتے ہیں اور ہمارا تعلق سندھ کے سماٹ قبائل سے ہے۔ کلھوڑوں کے عروج میں آنے سے قبل اپر سندھ کا بیشتر حصہ پنھوروں کے تسلط میں تھا جو انہوں نے خونریز جنگوں کے بعد ہم سے فتح کیا۔ ٹالپور میروں کی بغاوت کے بعد جب کلھوڑوں نے قندھار سے مدد مانگی اور نتیجہ کے طور پر مدد خان پٹھان نے سندھ پر یلغار کی تو ابھی ہم لوئر سندھ میں اگھمامانا کے علاقہ میں مضبوط تھے۔ ایک دفعہ پھر اس یلغار کا نشانہ ہم لوگ بنے۔ اور ہمارے لوگ پسپا ہو کر تھراوڑی (سورٹھ مارو) کی طرف جو راجستھان میں ہمارا آبائی علاقہ تھا لوٹ گئے۔ اس طرح ایک دفعہ پھر ہم اپنے اجداد کی طرح خانہ بدوشی اور چرواہ گری کرنے پر مجبور ہوئے بعد میں ٹالپوروں نے کلھوڑوں کو شکست دی اور پھر انگریزوں نے ان کو شکست دے کر اپنی حکومت قائم کر لی۔" صدیق نے سانس لینے کے لئے بیڑی کا ایک لمبا سا کش لگایا۔

"اس زمانہ میں سندھ میں دو بڑی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ایک طرف تو انگریزوں نے سندھ کے جنگلات صاف کر کے سکھر بیراج کی بنیاد ڈالی تو دوسری طرف ریگستانی علاقوں میں

بہت بڑا قحط پڑا جو غالباً راجستھان میں چھپنے کا کال کہلاتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہمارے دادا عاقب پھنور نے ریگستانی علاقے سے نقل مکانی کر کے نارا کنال کے علاقہ میں ڈیرے ڈالے اور جب نہریں نکلیں تو موجودہ جگہ پر آن بسے جو قدیم اگھامانہ سے چند میل کے فاصلہ پر ہے۔ ہمارے قبیلے کے کچھ لوگ نگر پارکر کے قریب آباد ہیں اور کچھ تقسیم ہند کے بعد مہاجرین بن کر واپس آئے جن کا ایک گوٹھ یہ سامنے نظر آتا ہے۔" صدیق نے انگلی کے اشارے سے اس نئی گوٹھ کی نشان دہی کرتے ہوئے کہا۔

"قصہ مختصر میں 1956ء میں یہاں ایک ہاری گھر میں پیدا ہوا تھا۔" صدیق خاموش ہو گیا۔

"سنا ہے کہ تم سندھ یونیورسٹی کے گریجویٹ ہو۔ پہلے یہ بتلاؤ کہ تم نے تعلیم کیسے حاصل کی؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"جب میں چھوٹا تو مجھے یاد ہے کہ ہمارے خاندان نے بہت فاقے کئے اور دکھ جھیلے۔ میرے دادا نے اصرار کیا کہ خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہو مجھے تعلیم حاصل کرنی چاہئے تاکہ ہماری تقدیر بدل سکے۔ ہو سکتا ہے کہ میں ایک دن جج بن جاؤں! کم سے کم میرے دادا نے تو میرے بارے میں یہی خواب دیکھے تھے۔"

"خاص طور پر جج ہی کیوں؟" میں نے سوال کیا۔

اس پر صدیق کی آنکھیں تنگ ہو کر دور خلاء میں گھورنے لگیں اور پھر بہت ہی گھمبیرتا سے اس نے کہا۔

"ہو سکتا ہے اس نے جاگیرداروں کے ہاتھوں بہت ناانصافیاں دیکھی ہوں؟" وہ پھر خاموش ہو گیا ____

"تمہیں تعلیم حاصل کرنے میں خاصی مشکلات پیش آئی ہوں گی؟" میں نے بات جاری رکھی۔

"مشکلات؟" وہ طنزیہ طور پر مسکرایا۔ "ہمارے دکھ بیان کرنے کے لئے مشکلات تو ہلکا سا لفظ ہے۔ میں ابھی پرائمری سکول میں تھا کہ میرے دادا کا انتقال ہو گیا۔ اور اس کے بعد مجھے اپنے ابا کا ہاتھ بھی بٹانا تھا اور اس ہاتھ بٹانے میں کھیتوں کی بوائی۔ سیرابی۔ کٹائی کے ساتھ ساتھ روزانہ بھینسوں، بیلوں اور بکریوں کے لئے منوں گھاس کاٹنا اور چارہ کترنا بھی شامل تھا۔ مشکل سے مشکل حالات میں جانور ہمارے لئے واحد سہارہ ہوتے ہیں۔" اس نے پھر سے ایک بیڑی سلگائی۔

جب میں نویں جماعت میں تھا تو میرا والد بیمار پڑ گیا۔ اب فصلوں کو سنبھالنا اور جانوروں کو بچانے کا بوجھ میری ماں کے ساتھ ساتھ میرے کندھوں پر آن پڑا۔ میں شاید اس وقت پندرہ سال کا تھا۔ میری اماں مجھے منہ اندھیرے ہی اٹھا دیتی۔ میں ہل اور بیل لے کر کھیتوں کا رخ کرتا اور سورج نکلنے تک کام کرتا پھر میں اسکول جاتا جو چار میل کے فاصلہ پر جھمبڑ کے قصبہ میں تھا۔ دوپہر کے دو بجے میں واپس لوٹتا۔ مرچ اور لسی کے ساتھ دو موٹی روٹیاں نگلتا اور پھر درانتی اٹھا کر جانوروں کے لئے گھاس کاٹنے چلا جاتا اور شام پڑے پوری ایک بیل گاڑی گھاس سے بھر کر گھر لوٹتا۔ میری ماں مجھے جانوروں کو پانی پلانے اور دودھ نکالنے میں میری مدد کرتی۔ غرضیکہ کام سے فراغت پاتے پاتے رات کے نو بج جاتے اور میں تھکن سے چور غنودگی کے سے عالم میں پڑ کر سو رہتا۔ لیکن ٹھیک رات کے ڈھائی بجے کبھی اندھیری اور کبھی چاندنی رات میں پھر اپنے پیروں پر ہوتا۔ پورے سیزن جب تک میرا باپ بیمار رہا میں یوں ہی کام کرتا رہا اور اس طرح میں میٹرک تک پہنچا۔

میٹرک پاس کرنے کے بعد جھمبڑ میں تین سو روپے ماہوار پر اوکڑائے کلرک بن گیا۔ مگر اس کام میں میرا پورا دن ضائع ہو جاتا اور میں کالج نہیں جا سکتا تھا جو میرے گاؤں سے پندرہ میل دور ٹنڈو اللہ یار میں تھا۔ لہٰذا میں نے نوکری چھوڑ دی اور ایک دفعہ پھر اپنے والد کا ہاتھ بٹانے لگا اور پھر ہفتہ میں چند دن نکال کر کالج جانے لگا۔ میرا دماغ برا نہیں تھا۔ میں نے 1978ء میں گریجویشن کرلی۔ یہ وہ وقت تھا جب جرنل ضیاء کے مارشل لاء نے پیپلز پارٹی کا تختہ الٹ کر ملک کی باگ ڈور سنبھالی تھی۔ حالانکہ روایتی طور پر ہمارے خاندان کا تعلق حر تحریک سے تھا اور پیپلز پارٹی کے دور میں حر ہونے کے حوالے سے ہم نے بھی پیپلز پارٹی کے زمینداروں کے ہاتھوں بہت تکلیفیں اٹھائیں تھیں مگر ضیاء کی مارشل لاء حکومت نے سندھ کے تمام دیہاتیوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکا۔ میرے والد کی صحت اب ٹھیک نہیں رہتی تھی اس لئے میں نے نوکری حاصل کرنے کی بہت کوشش کی۔ مگر ہمارا پرسان حال کوئی بھی تو نہ تھا۔ سندھ کے پڑھے لکھے نوجوانوں میں بددلی کی یہی سب سے بڑی وجہ رہی ہے۔" وہ ایک دفعہ پھر خاموش ہو گیا۔

"تو پھر چارو ناچار تم نے ہارپے کا کام جاری رکھا۔ تو اب کیسا محسوس کرتے ہو۔ کیا تمہاری سال بھر کی گزر بسر ٹھیک ہو جاتی ہے؟" میں نے پھر سے لقمہ دیا۔

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" اس نے زور دے کر کہا۔ ہم عموماً سال میں دو فصلیں بوتے ہیں۔ یعنی چیت میں چار ایکڑ گندم اور کٹی کے وقت پانچ ایکڑ کپاس' مگر ہاری' زمیندار

کے موجودہ پیداواری رشتوں میں ہم کسی بھی صورت چیت کی فصل میں دو ہزار اور کٹی کی فصل میں تین ہزار روپے سے زائد نہیں کما سکتے اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ سال بھر کی یہ کمائی ہماری جیبوں تک پہنچ سکے۔ مثال کے طور پر پچھلے سال چیت کی فصل کی کٹائی کے وقت میرا ننھا بچہ بیمار پڑ گیا۔ میں بیک وقت یا تو اپنے بچے کو بچا سکتا تھا اور یا فصل کو ____ زمیندار نے اصرار کیا کہ میں فصل پر توجہ دوں کیونکہ میرے پاس بچے کے علاج معالجے کے لئے بھی پیسہ ٹکہ نہ تھا۔ جب تک میں فصل سے فارغ ہوا بچہ محض ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا۔ فصل کٹنے پر جب میں ڈاکٹر کے پاس اسے لے گیا تو اس نے کہا کہ اسے پیلیے کی بیماری ہے اور اگر میں چند دن اور دیر کرتا تو اس کے بچنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ غرضیکہ جو کچھ میں نے کمایا تھا وہ ڈاکٹر کی نذر ہو گیا۔

اس سال کپاس کی کٹائی کے وقت میرا ایک بیل مر گیا۔ لہٰذا ساڑھے تین ہزار روپے میں مجھے دوسرا بیل خریدنا پڑا۔ اب آپ خود حساب لگا لیں کہ سال بھر میں ہم نے کیا کمایا۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک پورے خاندان کا روٹی، کپڑے اور مکان کا مسئلہ الگ رہا اور شادی، بیماری اور موت اس کے علاوہ۔ اگر ہمارے پاس برے دنوں کے لئے جانور نہ ہوں تو ہم پیر رگڑ رگڑ کر بھوکوں مر جائیں۔ کسان کی زندگی بہت بھیانک ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہاری کے مقابلہ میں بیل کی زندگی کہیں آسان ہے۔ حقیقت میں ہاری تو کولھو کے بیلوں کی طرح ہیں جو آنکھ پر پٹی بندھے ایک محدود دائرے میں بس مرتے دم تک چلتے ہی رہتے ہیں اور روشنی دیکھنا ان کا مقدر نہیں اور یہ سب کچھ محض زندہ رہنے کے لئے کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ ہمارے پاس کوئی دوسرا راستہ ہی نہیں۔" وہ دھیرے دھیرے ایک فلاسفر کی سی سنجیدگی اور شائستگی کے ساتھ بولتا گیا اور اس تمام عرصہ اس کی آنکھیں دور کہیں شفق میں کچھ ڈھونڈتی رہیں جیسے انہیں امید کی کسی کرن کی تلاش ہو۔

"تو پھر کیا کیا جائے۔" کیا تم نے اس گھناؤنی زندگی سے چھٹکارہ حاصل کرنے کا سوچا اور یہ کہ اس کا حل کیا ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔ وہ زور سے ہنسا۔ "حل تو تم کو بھی معلوم ہے۔ مگر اس پر عمل کرانا دوسری بات ہے۔ ہمارے تمام تر دکھوں کی اصل وجہ ہمارے موجودہ جاگیردارانہ نظام میں چھپی ہوئی ہے۔ چند لوگوں کے پاس لاکھوں ایکڑ زمین کی ملکیت ہے جب کہ ہم جیسے لاکھوں لوگوں کے پاس ایک ایکڑ زمین بھی نہیں ہے۔ یہی وہ غیر منصفانہ زرعی تقسیم ہے جو پورے ملک میں بھوک، افلاس اور بیماری و نیز جہالت کی ذمہ دار ہے جاگیرداریوں کا یہ نظام غیر فطری اور مجرمانہ حد تک غیر انسانی ہے اور یہ محض چند

خاندانوں کے مفاد کی خاطر قائم ہے۔" اس نے جذباتی ہو کر کہا۔

"مگر ایوب خاں اور بھٹو صاحب کی زرعی اصلاحات کا بڑا چرچا ہے۔ کیا اس سے جاگیرداریوں کا کچھ محاسبہ نہیں ہوا؟" میں نے بحث جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ زرعی اصلاحات غالباً کاغذوں پر ہوئی تھیں۔ مگر زمین پر ان کا کوئی اطلاق نہیں ہوا۔ اگر ہوا بھی تو بس نام کو۔ زمینداروں نے کل زمین اپنے پاس ہی رکھیں اور ان کے پاس ایسا کرنے کی پوری قوت بھی ہے۔ ان کے اپنے گوٹھ ہیں لٹھ بردار ہیں۔ ذاتی جیلیں ہیں۔ زمیندار بذات خود اپنے تیئں ایک حکومت ہیں۔ پولیس تو ویسے ہی ان کے در کی غلام ہے۔ یوں بھی اپنے ملک میں مارشل لاء نہیں ہوتا تو جمہوریت کے نام پر جاگیرداروں کی حکومت ہوتی ہے۔ کیا آپ امید رکھتے ہیں کہ وہ خود ہی اپنی جاگیرداریاں ختم کر دیں گے۔ یہ تو محض خوش فہمی ہی ہو سکتی ہے۔

کاغذی اصلاحات ہاریوں کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ یوں بھی یہ ان پڑھ لوگ ہیں۔ ہاری تو ہل کی نوک سے لکھی ہوئی زمین کی لکیریں پڑھنا جانتے ہیں اور وہ یہ بھی خوب جانتے ہیں کہ ان لکیروں کی ابھی تک ایک انچ زمین بھی ان کے حصہ میں نہیں آئی ہے۔"

حر بغاوت

ہم میں سے کتنے لوگ آج واقف ہیں کہ تحریک احرار کے شاہ اسماعیل نے 1824ء میں ٹنڈو اللہ یار کے مقام پر سید صبغت اللہ اول سے ملاقات کر کے انہیں حر تحریک میں شمولیت کی دعوت دی تھی۔ نتیجہ کے طور پر سید صبغت اللہ اول نے چھ سو حروں کا ایک جتھا تیار کیا اور سید احمد بریلوی کے ہمراہ سرحد کی مہم پر روانہ کر دیا۔ تاریخ میں اس واقعہ کو پہلی حر تحریک کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

مگر 1843ء میں انگریزوں کے ہاتھوں سندھ فتح ہو جانے کے بعد یہ حر تحریک انگریزی نو آباد کار نظام کے خلاف جنگ آزادی میں تبدیل ہو گئی۔ 1896ء سے لے کر 1947ء تک انگریزوں کو سندھ میں دو بڑی حر کسان بغاوتوں کا سامنا کرنا پڑا جنہیں انگریزوں نے دیسی فوجوں کی مدد سے بہت بے دردی کے ساتھ کچل دیا۔

تیسری اور آخری تحریک تیس کی دہائی میں اس وقت شروع ہوئی جب انگریزوں نے سید صبغت اللہ دوئم کو قید کر کے کوئی آٹھ سال کی مدت کے لئے جنوبی ہندوستان اور بنگال کی جیلوں میں رکھا۔ یہ تحریک اس وقت اپنے عروج پر پہنچی جب انگریزوں نے سید صبغت اللہ دوئم کو 1943ء میں پھانسی دے دی۔

اس زمانہ میں انگریزوں نے حر بغاوت کو کچلنے کے لئے نہ صرف مارشل لاء لگایا بلکہ متاثرہ دیہاتی علاقوں پر ٹینکوں اور ہوائی جہازوں سے بمباری کی اور کئی ڈویژن فوج کے ساتھ چڑھائی کی۔ مگر حر کسانوں نے جدید آباد کار نظام کی فوجوں اور انتظامیہ کا دشمن سے چھینے ہوئے ہتھیاروں کے ساتھ ڈٹ کر مقابلہ کیا اور ناقابل یقین حد تک دلیری اور شجاعت کا مظاہرہ کیا۔ اس جدوجہد نے زیادہ تر سانگھڑ ضلع کے مکھی ڈھنڈ کے علاقہ میں زور پکڑا اور پھر سکھر اور خیرپور ڈویژنوں کے مشرقی علاقوں کے ساتھ ساتھ صحرا تھر تک پھیل گئی۔

اس خونریز معرکہ آرائی میں سینکڑوں مزاحمتی گوٹھ اور گاؤں جلا کر راکھ کر دیئے گئے جن کا آج زمین پر نام و نشان تک نہیں ملتا۔ ہاتھ آنے والے مردوں کو پھانسیاں دی گئیں یا جیلوں میں ٹھونس دیا گیا۔ بچوں اور عورتوں کی بھی بے حرمتی کی گئی اور پھر ان کی اکثریت

کو 1924ء کے جرائم پیشہ ایکٹ کے ماتحت ر سٹلمنٹ کیمپوں میں منتقل کر دیا جو نازی جرمن کمپنیوں کی طرز پر بنائے گئے تھے۔

اگر آپ نے حر دشمن سندھ کے پولیس گورنر ٹی۔ ایچ۔ لیمبرک (LAMBRICK (T.H کی کتاب "دہشت پسند" (THE TERRORIST) پڑھی ہو تو آپ کو اس کتاب کا ہیرو سائیں راکھیو بیھن ضرور یاد ہو گا جو مضبوط طویل قامت اور جنونی حد تک آزادی کا متوالا تھا اور جس نے تحریک کے نقطہ عروج پر پھانسی کھائی۔

حسن اتفاق سمجھیں یا کوئی حقیقت مگر جس حر باغی کا میں یہاں ذکر کرنے لگا ہوں اس کا نام بھی سائیں اللہ ورایو بیھن ہی ہے۔ جو موجودہ وقت سانگھڑ ٹریننگ کالج میں تعلیم کا استاد ہے۔ سائیں راکھیو بیھن کے مقابلہ میں اللہ ورایو بیھن پستہ قد۔ مہذب اور نفیس شخصیت کا حامل ہے۔ وہ سندھی زبان کا نامور شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ "رنگا رنگ ملیشیا" کے نام سے ایک کتاب کا مصنف بھی ہے۔ ملیشیا اور آسٹریلیا کا یہ سفر انہوں نے 1980ء میں ٹیچر ٹریننگ کے سلسلہ میں کیا تھا۔ سائیں اللہ ورایو ایم۔ اے (تعلیم) ہیں اور تاریخ اور انتھرو پولوجی کے مشتاق شاگرد ہونے کے ساتھ ان مضامین میں ڈاکٹریٹ کرنے کا خواب بھی دیکھتے ہیں۔

اللہ ورایو بیھن سانگھڑ ضلع میں گڑانگ نام کی ایک گوٹھ میں ایک حر ہاری خاندان میں اس وقت پیدا ہوئے جب آخری حر تحریک پوری شدت کے ساتھ جاری تھی اور گڑانگ گوٹھ کا اس سلسلہ میں ذکر لیمبریک کی کتاب میں بھی آتا ہے۔ مگر کسی وقت جھول کے مشرق میں واقع گڑانگ کی بستی کا اب زمین پر کوئی نام و نشان باقی نہیں ہے۔

جب انگریزی فوجوں نے گڑانگ کا محاصرہ کیا تو اللہ ورایو کی عمر محض ایک سال کی تھی۔ اس کے والد سمیت اس گاؤں کے بیشتر مرد پہلے ہی جیلوں میں بند تھے۔ عورتوں اور بچوں کو گھیر کر ایک میدان میں اکٹھا کیا گیا اور ان کے گھروں کو فصلوں اور جانوروں سمیت آگ لگا دی گئی۔ اس کے بعد انہیں پاپیادہ نواب شاہ کے ر سٹیلمنٹ کیمپ لے جایا گیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ حر لڑاکوں کو ان کی علاقائی آبادی کی حمایت حاصل نہ رہے۔ یہ حکمت عملی انگریز نو آباد کار ملایا کے جنگلوں میں کیمونسٹ گوریلا تحریک کے خلاف بڑی کامیابی کے ساتھ آزما چکے تھے۔

"ر سٹیلمنٹ کیمپ کے بارے میں آپ کے ابتدائی تاثرات کیا ہیں؟" میں نے اللہ ورایو سے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ جب میں تین یا چار کا سال تھا۔" اس نے ملامت کے ساتھ بولنا شروع کیا۔" تو کیمپ کی زندگی کے بارے میں میرا اولین تاثر غالباً میری ماں کے حوالے سے ہے۔ جب میں نے انگلی کے اشارے سے دروازے پر کھڑے ایک خاکی وردی میں ملبوس خوفناک شکل کے ایک سپاہی کے بارے میں پوچھا تھا کہ اماں یہ کون ہے؟ اور میری ماں نے غالباً بدحواس ہو کر اپنے ہاتھ سے فوراً میرا منہ بند کر دیا تھا اور پھر تیزی سے مجھے وہاں سے نکال لے گئی تھی۔ کیونکہ اس سپاہی نے رائفل تان کر میری ماں کو مار دینے کی دھمکی دی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ اس وقت میری ماں کے چہرے پر دہشت کے آثار تھے اور آنکھوں میں خوف اور سراسیمگی۔

"اسی زمانے کا' ایک اور واقعہ بھی مجھے یاد پڑتا ہے جب کچھ لوگوں کو ایک ہتھیار بند دستہ کی حفاظت میں کیمپ میں لایا گیا تھا۔ یہ وہ سزا یافتہ مجرم تھے جن کی سزا پوری ہو چکی تھی پر انہیں اپنے خاندان والوں کے ساتھ اب کیمپ میں رہنا تھا۔ میری ماں نے پہلے تو مجھے کھینچ کر اپنے جسم کے ساتھ چپکایا اور پھر ہلکے سے میرے کانوں میں کانا پھوسی کرتے ہوئے کہا۔

"اللہ واریو! درمیان میں اس آدمی کو دیکھتے ہو جس نے سفید کپڑے پہن رکھے ہیں؟ وہ تمہارا باپ ہے!" مجھے یاد ہے کہ میں نے کسی بھی جذبات سے عاری نگاہوں سے اس آدمی کی طرف کچھ دیر تجسس سے دیکھا تھا اور اس طرح جیل کیمپ میں میرے باپ کے ساتھ وہ میری زندگی کی پہلی ملاقات تھی۔

"کیمپ کوئی سولہ ایکڑ زمین پر پھیلا ہوا تھا۔ گو کہ میرے خاندان کو آج تک ایک ایکڑ زمین کی ملکیت بھی نصیب نہیں ہوئی" ورایو نے طنزیہ ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

"اس زمانہ میں یہ کیمپ تقریباً وہاں قائم تھا جہاں اب نواب شاہ شوگر مل قائم ہے۔ اس کیمپ کی باقیات کے طور پر شاید ایک چھوٹی سی پولیس پوسٹ اب بھی موجود ہے۔ ہمارے سینکڑوں ہاری خاندان اپنے ہاتھوں سے بنائی ہوئی گھاس پھوس کی جھونپڑیوں یا گارے سے بنائے ہوئے چھوٹے چھوٹے گھروندوں میں رہتے تھے۔ ان میں سے بیشتر خاندان کیمپ' جیل خانوں' گوٹھوں اور ہسپتالوں کے درمیان بکھرے پڑے تھے۔ ان میں کتنے ہی ایسے خاندان تھے جن کے لواحقین جنگ میں مارے گئے تھے یا پھانسی پر لٹکا دیئے گئے تھے۔ ہمارے پڑوس میں کچھ ایسے بوڑھے والدین بھی تھے جن کے خاندان کے تمام جوان مرد مارے جا چکے تھے۔ ان میں کچھ نوجوان عورتیں تھیں جن کے خاوند یا تو مارے

گئے تھے یا جیلوں میں بند تھے وہ اپنے بوڑھے سسرال والوں کے ساتھ رہتی تھیں۔ ہمارے درمیان کچھ یتیم بچے بھی تھے جن کے والدین یا تو لاپتہ تھے اور یا جنگ میں کام آ چکے تھے۔ جب رات پڑتی تو ان جھونپڑیوں سے دبی دبی آہوں اور سسکیوں اور یا پھر کراہنے کی آوازیں آتیں اور پھر بقیہ خنک اندھیری راتیں ان کے آنسوؤں میں بھیگ جاتیں ____ ہاں! اب بھی مجھے یہ سب کچھ یاد ہے۔ بلکہ بھلائے سے بھی نہیں بھولتا۔" ورایو نے پتھریلی آنکھوں سے خلاء میں گھورتے ہوئے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔

"ہم دن بھر کے لئے اپنا روزگار مہیا کرنے کے لئے چند میل کی حدود تک کیمپ سے باہر جا سکتے تھے تاکہ محنت مشقت کر کے اپنا اور بچوں کا پیٹ پال سکتے۔ مگر اتنے سارے لوگوں کے لئے محدود علاقے میں کام تلاش کرنا بہت مشکل کام تھا۔ اس لئے ہم اکثر بھوکے ہی سو جاتے۔ صبح اور شام باقاعدہ گنتی ہوتی جس میں ہم سب کو حاضر ہونا ضروری ہوتا۔ اس لئے کیمپ کا کوئی شخص حدود سے باہر نہیں جا سکتا تھا۔ کیمپ میں بیمار لوگوں کی تیمارداری کے لئے ہسپتال یا ڈسپنسری کا کوئی بندوبست نہ تھا۔ غرضیکہ ریسٹلمینٹ کیمپ کی زندگی جیل سے بھی زیادہ سخت تھی جہاں کم سے کم دو وقت کا کھانا تو مل سکتا تھا۔

"مگر ہم میں کتنے ہی باحوصلہ مرد اور عورتیں تھیں جو اس برے وقت میں امید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑتے اور جیالے حر لڑاکوں کی دلیرانہ داستانیں سنا کر ہمارا حوصلہ بلند کرتے۔ خاص کر ان جانبازوں کی کہانیاں سنا کر جنھوں نے نعرے لگا کر مسکراتے ہوئے پھانسیوں کو قبول کیا اور دشمن کے سامنے ہار نہیں مانی۔ ان کا مقبول ترین نعرہ 'بھج پیر پگارا' تھا یعنی یا پیر پگارا مدد۔

"کبھی کبھی اندھیری راتوں میں جمع ہو کر وہ بہت ہی درد ناک گیت گاتے۔ جس میں اپنے گھروں کو لوٹ جانے اور اپنے بچھڑے ہوئے عزیزوں سے جا ملنے کی امنگیں موجزن ہوتیں۔ شاہ عبداللطیف کا سرابروی اکثر سننے میں آتا کیونکہ ہم میں بڑی تعداد صحرائی لوگوں کی تھی۔

"ویڑھی چنن ڈے ویندی۔ عمر
آھوں ماڑوڑن ڈے ویندی
ڈے۔ ڈاڈا نے پکھڑین"

(اوہ عمر! میں ایک دن اپنے مارو لوگوں میں ضرور لوٹ جاؤں گی جہاں وہ اپنے جھونپڑوں میں

اب بھی منتظر ہوں گے۔)

"چاندنی راتوں میں کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ہم سب ایک دائرے میں بیٹھ جاتے اور بیچ میں ایک عالم ہوتا جو شاہ لطیف کی بیت گا کر سناتا۔ مجھے یاد ہے ابوڑا فقیر بہت مقبول تھا اور جب وہ گاتا تو لوگ وجد اور کیفیت میں آ جاتے۔ ان کے سر پیچھے کی طرف جھک جاتے۔ آنکھیں بند اور وہ فرط جذبات میں دھمال کی طرح ناچنا شروع کر دیتے اور وہ ابوڑا فقیر کی آواز پر دہراتے۔

دسسی ____ توں جو سڈ کیا

سے ھوت بدھا۔ یا دوست بدھا۔"

(سسی تو نے جو پہاڑوں کو پکارا ہے۔ دوست ضرور سنیں گے۔ پنوں ضرور سنے گا۔)

انہی دنوں ہندوستان کی تقسیم وجود میں آئی تو میں کیمپ میں چھ سال کا ہو چکا تھا۔ یہ سن کر کہ ملک آزاد ہو گیا ہے ہم خوشی سے ناچنے لگے۔ ہم نے سوچا اب ہماری آزادی بھی دور نہیں۔ ریل کی پٹڑی ہمارے کیمپ کے ساتھ ہی سے گزرتی تھی۔ ہم نے ہندوستانی مسلمانوں کو بری حالت میں ریل کے ذریعہ آتے دیکھا اور ان کو اس بری حالت میں دیکھ کر کچھ عرصہ کے لئے ہم اپنے دکھ بھول گئے۔ ہم نے ان کے لئے کھانا اور کپڑے جمع کئے اور ریفیوجی کیمپوں میں ان تک پہنچائے۔

اب ہم نے کیمپ سکول میں صبح کی دعا کے طور پر خدا بادشاہ کی عمر دراز کرے LONG LIVE THE KING پڑھنی بند کر دی۔ ہماری نئی کاپیوں پر اب ایک نقشہ بنا تھا جس پر ہرا اور سفید رنگ میں جھنڈا لہرا رہا تھا۔ ہر چیز تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔ مگر ہم نے بڑی مایوسی کے ساتھ محسوس کیا کہ ہمارے محافظ دستہ کے فوجی سپاہی جو اکثر پنجابی یا پٹھان تھے ان کے چہروں پر کسی قسم کی تبدیلی کے نشان نہ تھے۔ وہ اب بھی ہم سے حقارت آمیز لہجہ میں گالی گفتار سے ہی بات کرتے ____ بلکہ اب بھی چھوٹی چھوٹی باتوں پر رائفل کے دستوں سے ہماری تواضع اسی شدت کے ساتھ کرتے۔

ایک اور سال اسی طرح گزر گیا۔ مگر ہم کیمپ میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے رہے۔ ایک دن ہم کو بتلایا گیا کہ سندھ حکومت کا ایک بڑا وزیر کیمپ میں آنے والا ہے۔ ہمارے بزرگوں نے ہمیں نہلا دھلا کر صاف کپڑے پہنائے آنکھوں میں سرمہ کاجل لگایا اور پھر کہا کہ جب وزیر صاحب آئیں تو ہم سب دست بستہ اس سے اپنے والدین کی رہائی کی بھیک مانگیں کہ شاید بچوں کی عاجزی پر ان کا دل پسیج جائے۔ ہم نے ایسا ہی کیا اور

ان سے کہا۔

"وڈا سائیں۔ ہاٹی ملک آزاد تھی ویو آ ہے
اساں جے ماٹن کھے بہ آزاد کریو"

(حضور والا۔ اب ملک آزاد ہے۔ مہربانی فرما کر ہمارے والدین کو بھی آزاد کر دیں۔) مجھے یاد پڑتا ہے کہ ہماری درخواست پر وزیر موصوف کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی اور اس نے غصہ بھری آواز میں جواب دیا۔

"تواں جامائیٹ دھاڑا تھا ہٹس
اسیں تواں کھے آزاد کریوں؟"

(تمہارے والدین ڈاکے مارتے ہیں اور ان کو آزاد کریں)

"کارے جو پھر۔ کوڑھ تھوگا لہائے!"

(کالے انگریز کا بچہ۔ سفید جھوٹ بولتا ہے) ایک بوڑھا حر ہلکے سے بڑبڑایا۔ گو کہ پاکستانی حکومت کی درخواست پر تمام حر جانبازوں نے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ سوائے رحیم ھنگورو کے جسے پکڑے جانے پر پھانسی دے دی گئی تھی۔ مگر اس سب کچھ کے باوجود ہم سب پہلی اپریل 1952ء تک کیمپ میں مقید رہے اور جب کیمپ سے آزادی ملی تو ہمیں کچھ سمجھ نہ آیا کہ کہاں جائیں۔ ہمارے گوٹھ تباہ ہو چکے تھے۔ نہ ہمارے گھر بچے تھے اور نہ ہی فصلیں لہٰذا میں اپنے بڑے بھائی کے ساتھ مل کر ایک وڈیرے کی بھینسیں چرانے لگا اور زندگی ایک دفعہ پھر کیمپ کی طرح سنگین ہو گئی۔ میں نے ایم۔ اے (تعلیم) کیسے حاصل کیا یہ ایک الگ سے داستان ہے۔ مگر جب بھی تھک ہار کر سستانے کو جی چاہتا ہے یا پیچھے کی طرف لوٹ کر ماضی کی دنیا میں جھانکنے کو دل کرتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے، کہ کیمپ کی غلامی سے پہلی اپریل کو دی گئی آزادی کا عمل ایسا ہی تھا جیسا کہ کسی نے ہمیں اپریل کا بیوقوف (APRIL FOOL) بنایا ہو۔

زمینداری

سیکنڈ نیویا کی سردیاں بہت سخت ہوتی ہیں۔ سال کے بیشتر حصہ میں برف دن رات آسمان سے سفید لعنت کی طرح برستی ہے۔ صبح کا زرد اور ٹھنڈا سورج جب طلوع ہوتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے سردی سے کانپ رہا ہو اور پھر جلد ہی برفانی چادر میں منہ ڈھانپ کر بادلوں کے پیچھے جا چھپتا ہے۔ چاند کا تو ذکر ہی کیا۔ اگر کسی رات نظر آ بھی جائے تو سردی کے مارے دم توڑتا نظر آتا ہے۔ وہاں کے دن اور رات میں بھی کوئی تناسب نہیں ہوتا۔ سردیوں کی راتیں منجمد اور طویل ہوتی ہیں اور دن تو سمجھو دو گھڑی کے لئے آتا ہے اور لوگ باگ جیسے گھروں اور کارخانوں میں محصور ہوں۔ میرے خیال میں ذی ہوش انسانوں کے لئے فطرت کی اس سے بڑی لعنت نہیں ہو سکتی۔

ناروے ہو کہ سویڈن ایک دہائی بیت جانے کے بعد بھی وہاں کی سردیوں کے تصور سے میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ذہن ساٹھ کی دہائی کی طرف لوٹ جاتا ہے جب ہم قراقرم کے پہاڑوں میں کوہ پیمائی کے دوران اونچی برفیلی چوٹیوں پر برفانی طوفان میں بے بس ہو کر ٹھٹھرتے ہوئے خیموں میں محصور ہو جایا کرتے تھے۔

مئی 1975ء کے ایک ایسے ہی سرد دن ناروے میں اپنے دوست زاہد علی خاں کے لکڑی کے مکان میں بیٹھے میں نے کہا تھا۔

"نہیں زاہد! تمہاری مہمان نوازی کا بہت بہت شکریہ۔ مگر یہ سرزمین مجھ جیسے ریگستانی کے لئے موزوں نہیں کیونکہ یہ بہت ہی بے جان اور ٹھنڈی ہے اور میرا دل تو اپنے دیس کی لوؤں کے لئے تڑپتا ہے۔"

"مگر یہ مت بھولو کہ تم ایشیاء کے سب سے بڑے غربت و افلاس اور جہالت کے سمندر میں واپس جا رہے ہو۔ غرق ہو جاؤ گے۔" زاہد نے تنبیہہ کی۔

"غرق ہی ہونا ہے تو میں پردیس کے برفانی جمود پر اپنے دیس کی تپتی دھرتی کو ترجیح دوں گا۔" میں نے ازراہ مذاق کہا۔

"دیس ہو کہ پردیس۔ ہر انسان کا اپنا گھر ہونا تو ضروری ہے۔ تمہارا تو دیس میں بھی

کوئی گھر نہیں۔ تم یہاں کم سے کم نئے سرے سے گھر بنا سکتے ہو
زاہد نے وکالت جاری رکھی۔

"گھر! گھر تو ایک حسین خواب کی طرح بچپن ہی میں ہندوستان میں رہ گیا تھا جہاں میں پیدا ہوا تھا اور اب شاید کہیں بھی نہ بنا پاؤں گا۔ مگر چاند۔ کونج اور دریائی مچھلی کی طرح ایک دن مرنے کے لئے اس گھر میں ضرور لوٹ جاؤں گا جہاں پیدا ہوا تھا اور میرے لئے گھر کا اتنا تصور ہی کافی ہے۔ یوں میں بڑے سے بڑے مادی مفاد کی خاطر کسی غیر ملک میں تیسرے درجے کا شہری کہلانے کو تیار نہیں چاہے وہاں دودھ کی نہریں ہی کیوں نہ بہتی ہوں۔ مگر ہاں ایک دفعہ سندھ کی مٹی کا قرض ضرور اتارنا ہے جس نے برے وقت میں پناہ دی۔"

اس بات چیت کے محض ایک ہفتہ بعد میں اندرون سندھ میں ٹنڈو سومرو نہر کے کنارے جلتی ریت پر اپنے پچاس ایکڑ کے خاندانی فارم کی طرف پیدل رواں تھا۔ ٹنڈو اللہ یار تحصیل میں نچلے سندھ کا یہ علاقہ اپنی زرخیزی کے لئے مشہور ہے۔ گرم گرم لوؤں کا ایک تھپیڑا میرے منہ پر آ لگا۔ میرے پاؤں جو قطب شمالی کے باد و باران میں رہ کر نرم پڑ چکے تھے پاوڈر جیسی گرم دھول میں جھلسنے لگے۔ میرے دائیں طرف ہزاروں ایکڑ کا ایک بڑا سا فارم تاحد نظر تک پھیلا ہوا تھا۔ فارم کے بیچ آم اور کیلے کا بڑا سا باغ تھا اور بقیہ زمین پر گنے کی فصل لہرا رہی تھی ____ ان کے بیچوں بیچ ننگے پیر اور ننگی پیٹھ سانولے رنگ کے سینکڑوں کسان چیونٹیوں کی طرح کام میں جتے تھے۔ سڑی ہوئی گھاس پھوس اور گارے میں لپی ہوئی ان کی چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں زمردی فصلوں کے حسین پس منظر میں بھدے اور مٹیالے داغ دکھائی پڑتے تھے۔ فارم کے عین بیچ جاگیردار کا قلع نما کوٹ تھا جس میں بیٹھ کر ایک سید خاندان پوری تحصیل پر راج کرتا تھا۔ کہتے ہیں کہ پاکستان کے قیام سے قبل سندھ کی بیشتر زمین ہندو بنیوں کے ہاتھوں گروی تھیں تقسیم ہند کی افراتفری میں جب بنئے ہندوستان چلے گئے تو ایک طرف تو زمینیں آزاد ہوئیں اور دوسری طرف کتنے ہی خاندان نئے سرے سے رئیس اور وڈیرے بن کر ابھرے۔ یہ سید خاندان بھی ان میں سے ایک تھا۔ اب اس فارم پر محض ایک ہزار ایکڑ آموں کے باغ کی سالانہ آمدنی کوئی ایک کروڑ روپے کے لگ بھگ تھی۔ جب کہ گنے اور گندم وغیرہ کی فصلیں مزید آدھ کروڑ سالانہ کی ہوں گی۔ گو میں حساب کتاب کے معاملہ میں خاصا کمزور واقع ہوا ہوں مگر زرعی فارمولا بہت آسان ہے۔ جتنا فارم بڑا ہو گا اس پر کام کرنے والے کسان اسی نسبت سے بھوکے اور

ننگے ہوں گے۔

"یہ کیا بات ہے سائیں ڈینو؟" ایک دفعہ میں نے ایک خستہ حال کسان سے پوچھا جو اس سید خاندان کا مرید تھا۔ "کہ پیروں اور سیدوں کے پاس اس قدر زمین ہے جب کہ تم کسانوں کے پاس کچھ بھی نہیں؟"

"جواب آسان ہے۔" سائیں ڈینو نے کہا۔ "جب سائیں ایران اور عربیہ سے یہاں آئے تو ان کی بغل میں قرآن تھا اور ہمارے پاس زمینیں تھیں۔ اب قرآن ہماری بغل میں ہے جب کہ کل زمین سیدوں اور پیروں کے پاس۔" یہ کہہ کر وہ زور سے ہنسا۔ خیر میں دور نکل گیا ہوں۔

ہاں جلتی ریت پر کوئی ڈھائی میل چلنے کے بعد جب میں اپنے فارم پر پہنچا تو میرے پاؤں میں چھالے پڑ چکے تھے اور مجھے لنگڑاتا دیکھ کر بھیل کسان خوب ہنسے۔

جوں ہی سورج غروب ہوا زمین نے ٹھنڈا سانس لیا اور پھرچپکے سے رات گھر آئی اور چاند ایک بڑی سی سرخ تھالی کی طرح نمودار ہوا۔ ریت ٹھنڈی ہو کر اب زمین پر بیٹھ گئی تھی اور خشک اور ٹھنڈی ساحلی ہواؤں نے اب ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ چاندنی رات میں آموں کے درخت سائیں سائیں کرتے جھولنے لگے۔ کسان تھک ہار کر اپنی اپنی جھونپڑیوں میں دبک گئے اور رات اپنی پراسرار خاموشی ہر طرف بکھیرنے لگی۔ کبھی کبھی کسی کتے کے بھونکنے کی آواز۔ جگالی کرتے بیلوں کی ڈکار اور دور کہیں سے الو کی پکار قرب و جوار کی زندگی کی واحد شہادت رہ گئی تھی۔

جھولتے نیم کے نیچے میں ایک جھونپڑے کے سامنے چارپائی پر خاموش بیٹھا فطرت کے اس نظارے میں محو تھا۔ جھونپڑے کے اندر بھنورا بھیل اپنے لئے کھانا پکانے میں مشغول تھا۔ بھنورے بھیل کی ادھیڑ زندگی اپنے ہاتھوں سے کھانا پکاتے گزر گئی تھی کیونکہ لاکھ جتن کے باوجود اس غریب کی شادی نہ ہو پائی تھی۔

چولھے کے ساتھ کھیلتی بلی کا ایک بچہ اور کتیا کا ایک پلہ اس کی واحد فیملی تھی۔ دبلا پتلا اور کالے رنگ کا بھنورا بھیل جب آہستگی سے جھومتے ہوئے میرے لئے ایک گرم گرم چائے کی پیالی لے کر آیا تو وہ آدمی کی بجائے ایک پراسرار سایہ نظر آیا۔

"اس دفعہ تو میں تیری شادی ضرور کراؤں گا۔" میں نے پرانا مذاق دہرایا۔ "شادی؟ مجھے تو کوئی بھیل اپنی لنگڑی' لولی یا اندھی لڑکی دینے پر بھی تیار نہیں اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ بھیل نہ دیتے ہوں تو نہ دیں مگر اس دفعہ جب میں یورپ گیا تو تیرے لئے ایک میم لے کر آؤں گا۔" اور میں نے دیکھا کہ اندھیرے میں اس کی آنکھیں اور سفید دانت چمکنے لگے۔

آدھی رات کو سونے سے پہلے جب میں نے آسمان پر ایک نظر ڈالی تو کھلے اور سلیٹی رنگ کے آسمان پر کہکشاں اور ستارے ہیرے اور موتیوں کی طرح جڑے نظر آئے اور پھر رات کی خاموشی اور اندھیرے نے ہر چیز کو نگل لیا۔

دوسرے دن صبح سویرے بھنورا مجھے چائے دے کر آم کے باغ میں پانی دینے کے لئے چلا گیا اور میں پاس ہی کی زمینوں پر اپنے کسان دوست یوسف بورڑو سے ملنے چل پڑا۔ جب میں گنے کی فصل سے ڈھکے ہوئے اس کے گھر کے قریب پہنچا تو دس سال کی کسان کی لڑکی لاڈی نے مجھے دور سے دیکھا جو وہاں بکریاں چرا رہی تھی۔ وہ ہرنی کی طرح کلیلیں کرتی اور نالے پھلانگتی دوڑتی ہوئی میرے پاس آئی اور زور سے ہنستے ہوئے سلام کے لئے میری طرف ہاتھ بڑھایا اور پھر کسانوں کی طرح زندہ دلی سے چلائی۔

"ایھ! خورشید! تو ولایت سے آگیا؟ ماما یوسف دیکھ کون آیا ہے؟" وہ ایک مضبوط گٹھے کی گول چہرے۔ کالی آنکھیں اور سیاہ بالوں والی ہاری لڑکی تھی اور یوسف بورڑو کی یتیم بھانجی تھی۔ اس کی آواز سن کر اس کا بھائی مولو اور یوسف کا لڑکا بخشو بھی گنے کے کھیت سے باہر نکل آئے۔ اور پھر دور سے یوسف بورڑو کی ہمیشہ کی طرح بڑبڑاتی آواز آئی اور دم کی طرح اس کے پیچھے اس کی بھولی بھالی بیوی تھی جس کو میں "ادی" کہتا ____ اس کے ہاتھ میں درانتی تھی۔ یہ لوگ پاس ہی جانوروں کے لئے گھاس کاٹ رہے تھے۔ وہ کسانوں کی روایتی گرم جوشی خلوص اور سادگی کے ساتھ لپٹ کر ملے۔ اس خاندان سے میری گاڑھی چھنتی تھی اور انہوں نے بھی ہماری دوستی میں کبھی مجھے زمیندار کا بیٹے ہونے کا احساس نہیں ہونے دیا تھا۔ اس زمانہ کے سندھ میں کسی قسم کا لسانی یا فرقہ واریت کا تعصب نہ تھا جو کسانوں میں بہرصورت نہیں ہوتا۔ ہمارے اس انسان دوستی کے رشتہ میں بے حد پیار اور خلوص تھا۔

سہانی صبح کی خنکی ابھی باقی تھی۔ یوسف نے اپنے ریڈیو پر سیلون کے پرانے گانے ٹیون کئے اور لتا منگیشکر کی سریلی اور مدھر آواز فضا میں گونجنے لگی۔ ادی جلدی سے گرم گرم چائے بنا کر لائی اور ہم گنے کے کھیت کے بیچ ایک ٹھنڈی پگڈنڈی پر بیٹھ گئے۔ اجرک کی کا بنھ بنا کر زمین پر اکڑوں بیٹھنے میں کتنا لطف آتا تھا۔ یوسف لتا منگیشکر کے گانوں کا بڑا

رسیا تھا۔ یوں بھی لتا کی سدا بہار آواز نے برصغیر کے منقسم لوگوں کے لئے ایک ثقافتی پل کا کام کیا تھا اور یوسف کی طرح میں بھی اس کے پرانے گانوں کا پرستار تھا۔ غالباً یہ گانے ہمیں ماضی کی بھول بھلیوں میں لیجا کر بچپن کی معصومانہ یادوں کی طرف لوٹا دیتے تھے۔

یوسف بورڑو تقسیم ہند سے قبل بدین ضلع میں نہایت غربت و افلاس کے مارے کسان گھرانے میں پیدا ہوا تھا اور اس کا بچپن کا زمانہ غلامی کی سی کیفیت میں رئیسوں اور وڈیروں کی اوطاقوں پر کام کرتے اور خانہ بدوشوں کی طرح در در کی ٹھوکریں کھاتے گزرا تھا۔

"مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اس زمانہ میں بدن کبھی پوری طرح سے ڈھکا ہو۔ اگر پیٹھ ڈھکی ہوتی تو پیر ننگے ہوتے اور پیٹ تو سدا ہی بھوکا ہوتا۔ ہم دو وقت کے کھانے کے لئے دن بھر دھندا پیٹتے مگر اس کا تحفظ نصیب نہ ہوتا۔ اگر ہمیں کھڑی فصل چھوڑ کر چلے جانے کا حکم ہوتا تو اف نہیں کر سکتے تھے۔" یوسف اکثر ماضی کی تلخیوں کا ذکر کرتا۔

کوئی دس سال قبل یوسف کا خاندان حیدر آباد ضلع کے اس زرخیز خطہ میں چلا آیا اور کئی زمینداروں کے دروں کی خاک چھان کر بالآخر سراسیمگی کی سی کیفیت میں میرے والد کے فارم پر چلا آیا۔

"صاحب اتنا کڑک تھا کہ شروع شروع میں اس کو دیکھ کر میں سہم جاتا اور کئی دفعہ فارم چھوڑ جانے کا سوچا۔ مگر پھر جلد ہی پتہ چل گیا کہ وہ بہت ایمان دار اور انصاف پسند آدمی تھا اور پھر نہ صرف اعتماد بحال ہو گیا بلکہ میں ان کا چہیتا ہاری بن گیا اور اس طرح اس فارم پر زندگی میں پہلی بار میں نے اپنی محنت کا پھل چکھا۔ بیلوں کے اچھے جوڑے خریدے۔ بھینس خریدی اور پیٹ بھر کر دو وقت کا کھانا کھایا۔" یوسف سالوں بعد ہنس ہنس کر میرے والد کے بارے میں ان کی چڑچڑی طبیعت اور دیانتداری کی داستانیں سناتا۔

یوسف انتہائی خستہ حالی کی صورت میں جب پہلے پہل میرے والد کے فارم پر ہاری بن کر آیا تو والد نے اسے ایک اچھے بیلوں کی جوڑی خرید کر دی۔ یوسف اور اس کا پورا خاندان نئی امنگ اور تمناؤں کے ساتھ کام میں جت گئے۔ مگر پرانے اور روایتی زمینداروں کو یوسف بورڑو کی نئی وفاداری پسند نہیں آئی۔ ایک رات اس کے گھر کی کچی دیوار توڑ کر اس کے دونوں بیل چوری کر لئے گئے جب کہ وہ دن کا تھکا ماندہ نزدیک ہی سو رہا تھا۔ یوسف بیلوں کے چلے جانے پر بچوں کی طرح بلبلا کر رویا۔ اس کی خوابوں بھری نئی دنیا پل جھپکتے میں مسمار ہو گئی۔ میرے والد نے اس کو دلاسا دیا اور آسان قرضے کی شرط پر ایک

اور بیلوں کی جوڑی خرید دی۔ یوسف اور اس کا خاندان ایک دفعہ پھر پاگلوں کی طرح کام میں جت گئے۔ پہلے ہی سال اس نے گنے کی فصل کا اس علاقے میں پیداواری ریکاڈ قائم کیا اور یوں پہلے ہی سال بیلوں کا قرضہ اتار دیا۔ اب اس نے پرانے بیلوں کو بیچ کر خوبصورت سندھی بیلوں کی جوڑی خریدی۔ زندگی کی پہلی بھینس خریدی۔ ایک اچھا سا ٹیپ ریکارڈر خریدا۔ یوسف اکثر یہ ذکر لے بیٹھتا جو بقول اس کے زندگی کا نیا موڑ تھا۔

ذرا دھوپ چڑھی تو ہم ستانے کے لئے اس کے گھر کے احاطے میں جا بیٹھے اور ادی نے چائے کا ایک اور پیالہ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ یوسف کی نگاہیں لگے ہوئے ایک نیم کے تازہ درخت پر مرکوز تھیں۔

"میں نے زندگی میں اپنے بدلتے ہوئے ڈیروں کے سامنے کتنے ہی نیم لگائے مگر ان کا سایہ مجھے کبھی نصیب نہیں ہوا۔ اب میں نے آخری امیدوں کے ساتھ یہ نیم لگایا ہے۔ خدا جانے میرے بچوں کو اس کا سایہ نصیب ہو گا کے نہیں۔" اس نے بہت سنجیدہ آواز میں مجھ سے آنکھیں چراتے ہوئے کہا۔

اس کے ٹھیک دس برس بعد یعنی جون 1985ء میں جب "اسٹار" کے لئے میں نے یہ کالم لکھا تو یوسف ہمیشہ کے لئے ہمیں چھوڑ کر جا چکا تھا۔ وہ کھیتوں میں کام کرتے کرتے اچانک دماغ کی نس پھٹ جانے کے کارن چلتا بنا۔ گو اس دس سال کے عرصہ میں یوسف کا مستقل ٹھکانہ تو بن گیا تھا مگر میں بذات خود مسلسل خانہ بدوشی کی سی کیفیت میں رہا اور جب میں ایک طویل عرصہ کے بعد یوسف کی موت کی خبر سن کر اپنے والد کے فارم پر پہنچا تو پہلی بار یوسف کی اونچی اور بڑبڑاتی ہوئی پرمذاق آواز کو نہ سن پا کر شدید صدمہ ہوا اور اس کی جگہ ادی کی دکھ بھری بین نے میرا سواگت کیا۔ وہ اونچی آواز میں رو رہی تھی۔

"اب بچے بابا کس کو کہیں گے۔ کھیت کون سنبھالے گا۔ فصلیں تجھے پکار رہی ہیں یوسف۔ اتنی دور نہ نکل جا۔ دیکھ بیل بھی پیاسے ہیں اور بھینسوں نے بھی چارہ نہیں کھایا۔ لوٹ آ یوسف تو ہمیں بیچ میں چھوڑ کر چلا گیا۔" ادی کی بین سن کر میرا دل پسیج گیا۔

میں نے اسے دلاسا دینے کی کوشش کی۔ جب وہ خاموش ہوئی تو میرے لئے چائے بنا کر لائی۔ ان سادہ لوح کسانوں میں مہمان نوازی ہر موقع پر فوقیت رکھتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ بخشو اب اپنے احاطے میں کھڑے ہوئے نیم کے درخت کی طرح لمبا چوڑا ہو گیا تھا اور اسی نیم کے سایہ میں کھڑا تھا اور مجھے یہ دیکھ کر کتنی خوشی ہوئی کہ یوسف کے بال بچے اپنے جانوروں سمیت اس نیم کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھے تھے جسے یوسف نے کتنی امنگوں

کے ساتھ لگایا تھا۔ اب نیم کے درخت کے جڑوں کی طرح یوسف کی نئی نسل کی جڑیں بھی اس دھرتی میں گہری ہو گئی تھیں۔ میری آنکھوں سے خوشی کے آنسو چھلک پڑے۔ یوسف اپنی منزل کو پہنچ گیا تھا۔

"مولو کہاں ہے؟" میں نے بخشو سے پوچھا۔

"وہ دو سال ہوئے فوت ہو گیا۔ گنے کی فصل میں پانی دیتے ہوئے اسے کالے ناگ نے ڈس لیا تھا۔" بخشو نے جذبات سے خالی آواز میں کہا۔

"لاڈی کہاں ہے؟" میں نے ادی سے پوچھا۔

"وہ پڑی ہے۔" ادی نے کٹیا کے ایک اندھیرے کونے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "وہ کئی مہینوں سے بیمار پڑی ہے۔ اسے خون گرتا ہے اور بند ہونے کو ہی نہیں آتا۔" یہ کہہ کر وہ ایک دفعہ پھر بین کرنے لگی۔

"تجھے کیا جلدی تھی اوہ یوسف! تم کچھ دیر اور انتظار کرتے۔ اب بخشو کی شادی کون کرے گا۔ اب لاڈی کو کندھا کون دے گا!"

میں جلدی سے اس کونے کی طرف لپکا جہاں ایک چارپائی پر لاڈی کا لاغر ڈھانچا پڑا آخری سانس لے رہا تھا۔ اس کا چہرہ اپنی گولائی کھو چکا تھا۔ اس کی آنکھیں اندر کو دھنسی تھیں اور اپنی چمک اور سیاہی کھو چکی تھیں۔ میں نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا تو وہ بخار میں جل رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ کر ہلکے سے مسکرانے کی کوشش کی اور اپنا لاغر ہاتھ میری طرف بڑھایا اور میں نے کچھ دیر اس کا ہاتھ تھام کر اسے حوصلہ دینے کی کوشش کی۔

"ایک سال قبل وہ لاؤں بیٹھی تھی۔ اس کی شادی منڈی تھی اور پھر وہ یکلخت بیمار پڑ گئی۔ شادی تو ہو گئی مگر اس کا خون بند نہ ہوا۔" ادی نے مجھے بتلایا۔

"ہم نے اسے ڈاکٹروں اور حکیموں کو دکھلایا۔ تھر کے ریگستان میں ایک اللہ والے سے تعویذ بھی کروایا۔ ایک جبلی فقیر کے پاس بھی گئے۔ مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔" اور ادی یہ کہہ کر پھر رونے لگی۔

شام کا سورج ایک بجھتے ہوئے الاؤ کی مانند مغرب میں غروب ہونے لگا تھا۔ میں نے ڈاکٹر کو لے کر دوسری صبح واپس آنے کا وعدہ کر کے اجازت چاہی۔ جیسے ہی کرر ڑ۔ کنڈی اور دیبی کی کانٹے دار جھاڑیوں سے پیر اور پہلو بچاتے ہوئے میں نے اس ستم زدہ دیہاتی

ماحول سے باہر نکلنے کی کوشش کی تو میرے ذہن میں بڑی شدت کے ساتھ ایک ہی خیال
آیا۔ نہیں! نہیں! مجھے ایسی زمین اور ایسی زمینداری نہیں چاہئے!

خون اور پسینہ

صدیوں ہی سے کسان غلامانہ ماحول میں جنم پا کر اور آدھے انسان کی سی زندگی بتا کر بھوک اور افلاس کی کیفیت میں وقت سے پہلے ہی مر جاتے ہیں۔ بچپن ہی سے پورے سماج کا اقتصادی بوجھ آسمانی لعنت کی طرح ان کے ناتواں کندھوں پر آن پڑتا ہے۔ مگر اس سب کچھ کے باوجود وہ اس گھاس کے مانند جیتے رہتے ہیں جسے جتنا ہی کاٹا جائے اتنا ہی پھیلتی جاتی ہے۔

زمینداروں کے پیروں تلے بے دردی سے کچلے ہوئے وہ اجل سے ابد تک قدم قدم پر ابتری، بے حرمتی، ذلت اور پستی کا شکار ایک بار بردار جانور کی طرح مسلسل چلتے ہی رہتے ہیں۔

خود بھوکے اور ننگے، اپنی ہی محنت کی فصل کے ایک ایک دانے کے لئے ترستے، تیسری دنیا کے کسان اپنی پیداوار سے پوری دنیا کی بھوک مٹاتے ہیں۔ دنیا کی موجودہ تاریخ حقیقت میں ان کے بکھر جانے اور یا پھر سے اکٹھا ہو جانے سے عبارت ہے۔ کسان انسانیت کا انتہائی پراسرار حصہ ہوتے ہیں۔ ناگزیر سے ناگزیر حالات میں بھی وہ بڑی ڈھٹائی کے ساتھ دھرتی سے چپکے رہتے ہیں اور جینے کی تڑپ ان کی گھٹی میں ہوتی ہے۔ فرانس کا بادشاہ نیپولین ہو یا چین کا چیئرمین ماؤزے تنگ، دنیا کے عظیم سورما کسان عورت کی کوکھ ہی سے جنم پاتے ہیں۔

خوشگن ماحول میں کسان اپنی سخت محنت اور خون پسینے سے دھرتی کو سبزہ زار بنا دیتے ہیں اور جب وہ بغاوت پر اتر آئیں تو دھرتی ان کے خون سے سرخ ہو جاتی ہے اور کسان کی یہی باطنی قوت اس کی ظاہری کمزوری بن جاتی ہے۔ کیونکہ استحصالی قوتوں کی فلاح کسانوں کو پابند سلاسل رکھنے ہی میں پنہاں ہوتی ہے اور اس طرح کسان اپنے مضبوط کندھوں پر زخمی دھرتی کا کل بوجھ سہارے تھکے ہوئے بیل کی مانند دھیرے دھیرے آگے کی طرف کھسکتے ہی رہتے ہیں۔

کہانوں کی کٹیائیں ہر دم زمینداروں کی حویلیوں سے گھری رہتی ہیں۔ کسان ہر وقت

اسی فضا میں محصور رہتے ہیں جس میں وہ سانس لیتے ہیں۔ وہ ایک دشمن دنیا میں یرغمالیوں کی طرح زندہ رہتے ہیں۔ ان کے چھوٹے چھوٹے گاؤں۔ گوٹھ جیل خانوں کی طرح ہوتے ہیں جن پر جاگیرداروں کے لٹھ بردار محافظ ہر وقت نظر رکھتے ہیں۔ کیا مجال ہے کہ وہ اپنی حدود سے تجاوز کرنے کی جسارت کریں یا اگر سر اٹھا کر چلیں تو چشم زدن میں بے معنی باتوں پر ان کے سر قلم کر دیئے جاتے ہیں۔ ان کی عورتوں اور بچوں کی بے حرمتی کی جاتی ہے۔ غرضیکہ وہ اپنی ہی دھرتی پر خانہ بدوشوں کی طرح بھٹکتے رہتے ہیں۔ گو کسان محض جانور نما زندگی گزارنے پر مجبور کر دیئے جاتے ہیں مگر پھر بھی وہ سخت جان جانور کی طرح آسانی سے نہیں مرتے اور اگر جلا بھی دیئے جائیں تو اپنی ہی راکھ سے پھر زندہ ہو اٹھتے ہیں۔

پاکستان کی تقریباً 80 فی صد آبادی کسان یا کسانی رشتوں پر مشتمل ہے جو دیہاتوں میں بکھرے پڑے ہیں۔ 1947ء میں نام نہاد آزادی کے نام پر ان کے خون سے دریا بہا دیئے گئے مگر نتیجہ کے طور پر آزادی کے سورج نے محض جاگیرداروں کے محلات ہی کو روشن کیا۔ جب کہ کسانوں کے مقدر میں گارے اور گھاس پھوس سے بنی اندھیری جھونپڑیاں ہی آئیں۔ نجات کا خواب ہمیشہ کی طرح ٹوٹ گیا۔ امید کا سورج ہمیشہ کی طرح مغرب میں غروب ہو گیا۔

برصغیر کی تقسیم کو آدھی صدی بیتنے کو چلی ہے۔ مگر اس عشرے میں کسان کی زندگی نہ صرف بد سے بد تر ہوتی چلی گئی بلکہ اسلام اور قوم کے نام پر اس کی تاریخ آگے کی بجائے پیچھے کی طرف لوٹا دی گئی۔ آج ان کو وہ مراعات بھی حاصل نہ رہیں جو مغل بادشاہوں کے زمانہ میں حاصل تھیں۔ بلکہ اب تو ہر جاگیردار ان کے لئے مغل بادشاہ کا درجہ رکھتا ہے۔

کارل مارکس کسانوں تک پہنچ ہی نہ پایا۔ ماؤزے تنگ کسانوں کی خوابی زندگیوں میں ہوا کے ایک لطیف جھونکے کی مانند آیا اور گزر گیا۔ برصغیر ہند و پاک میں بائیں بازو کی تحریک ایک خوبصورت دھوکے اور فریب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی اور اس خطہ کی موجودہ گراوٹ حقیقت میں بائیں بازو کی نظریاتی گراوٹ ہی سے تعبیر کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ ابتدا ہی سے ہند و پاک کی بائیں بازو کی تحریک نے قومی جدوجہد کے نام پر طبقاتی جدوجہد سے منہ موڑ لیا تھا جس کی وجہ سے ہندوستان کی تقسیم ممکن ہوئی۔ یہی عمل 1971ء کی خانہ جنگی کے دوران بنگالی قومی جدوجہد کے نام پر دہرایا گیا اور اب وہی ڈھونگ سندھو دیش کے نام پر سندھ میں رچایا جا رہا ہے۔ مسلمان جاگیرداروں نے بالخصوص قومی جدوجہد کے نام پر ہندوستان کی مسلمان عوام کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ہیں۔ تاکہ ان کی جاگیروں کو مسلمان

کسان یا عوام سے خطرہ لاحق نہ رہے۔

حقیقت میں مارکسزم کی سائنس کا کل نچوڑ طبقاتی جدوجہد ہی تھا اور دنیا میں جہاں کہیں بھی عوامی جمہوری انقلاب برپا ہوئے وہ طبقاتی جدوجہد کی حکمت عملی سے ہی رونما ہوئے۔ اس کے مقابلہ میں قومی جدوجہد کے نام پر بیروت اور سری لنکا جیسی مملکتوں کو جو ایک دن زمین پر جنت کہلاتی تھیں کھنڈرات کے ڈھیروں میں تبدیل کر دیا گیا اور انسانوں کو جانوروں میں تبدیل کر دیا گیا۔ غرضیکہ انقلابی جدوجہد کی اصل اور عوامی روح طبقاتی جدوجہد ہی میں پنہاں ہوتی ہے مگر عوام دشمن طبقات نے روس میں ترمیم پسندی اور چین میں رجعت پرستی کا سہارا لے کر ترقی پذیر دنیا کی طبقاتی جدوجہد کو تہس نہس کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج دنیا بھر میں عوامی جمہوری تحریکیں نہ صرف انحطاط پذیر ہو چکی ہیں بلکہ ماضی کے کامیاب انقلابات بھی پسپائی کی کیفیت کا شکار ہیں۔ آج مشرقی یورپ میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اسی کا نتیجہ ہے اور یہ سب کچھ اس وقت تک ہوتا رہے گا جب تک طبقاتی جدوجہد اپنا تاریخی اور سائنسی مقام واپس حاصل نہیں کر لیتی۔

اس سب کچھ کے باوجود اب بھی کسان انسانیت کی نجات کی آخری امید ہیں۔ گو ان کے ذہن آج بھی بقول ماؤزے تنگ کاغذ کے ایک خالی ورق کی طرح کورے اور صاف ستھرے ہیں جس پر کسی بھی وقت ایک خوبصورت نظم لکھی جا سکتی ہے۔ فی الحال اس سمت میں تو یہی کہہ سکتا ہوں۔

"ساتھیو!
ان کھیتوں کا رخ کرو
جہاں انسانوں کے سروں کی فصل اگتی ہے
جہاں بے جڑ اور بے گھر کسان
اور ان کی بھٹکتی نسلیں
قحط سالی کی سی کیفیت میں
اپنے خون اور پسینے میں لتھڑے
اپنے ہی کرخت ہاتھوں کو
کھاتی رہتی ہیں۔
پراسرار کسان!
جو پوری دھرتی کا بوجھ

اپنے مضبوط کندھوں پر سہارے
ہمیشہ کی طرح
اب بھی رواں دواں ہیں"

صوفی شہید

9 نومبر 1984ء کو ہزاروں لوگ سندھی شاعر عبداللطیف بھٹائی کی دو سو چالیسویں برسی منانے کے لئے بھٹ شاہ میں جمع ہوئے۔ مگر ان میں سے کتنے یہ جانتے تھے کہ اس کے اگلے ہی دن ایک ایسے جانباز صوفی شہید کا عرس تھا جس کے تحریکی نظریات اور عظیم قربانی نے شاہ عبداللطیف اور سچل سرمست جیسے صوفی شاعروں کو بے حد متاثر کیا تھا اور نہ صرف متاثر کیا تھا بلکہ انہیں معرفت اور طریقت کی راہ بھی دکھائی تھی اور وہ تھے جھوک کے صوفی شاہ عنایت اللہ شہید۔

صوفی شاہ عنایت اللہ نے پھانسی کھائی۔ شاہ عبداللطیف صحرا تھر گجرات اور کیر تھر کی پہاڑیوں میں بھٹکتے پھرے سچل سرمست کو بھی قید و بند کی صعوبتیں جھیلنی پڑیں اور بعد میں زہر دے کر مار دیا گیا یہ تینوں ہی شخصیتیں بل ترتیب ایک دوسرے سے منسوب تھیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان صوفی مجاہدوں کا حکمران کلہوڑوں کے ہاتھوں یہ حشر کیوں ہوا اور یہ کہ ان کی جدوجہد کا مقصد اور پیغام کیا تھا؟۔ ان سوالوں کا جواب ڈھونڈنے کے لئے ہمیں جھوک کے جیالے اور جانباز سپوت صوفی شاہ عنایت اللہ کی تحریک جدوجہد اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے واقعات کا تفصیل سے جائزہ لینا پڑے گا۔

صوفی شاہ عنایت اللہ جھوک شریف سے تین میل مشرق میں میرن پور کے مقام پر مخدوم سدھو لنگاہ کے گھر پیدا ہوئے یہ مغل بادشاہ اورنگ زیب کے آخری دور کا زمانہ تھا اس وقت جھوک بھورو پرگنہ کا حصہ تھا جو ٹھٹھہ سے تیس میل کے فاصلہ پر واقع تھا۔

قیاس ہے کہ صوفی شاہ عنایت اللہ پر مہدوی تحریک کے سید محمد جون پوری (1505ء_1440ء) کے نظریات کا بہت اثر تھا یہ بزرگ سمہ خاندان کے دور حکومت میں ٹھٹھہ آئے تھے سید محمد جونپوری اپنے حلقہ احباب کو دائرہ قرار دیتے تھے اور جو اس دائرہ میں شمولیت اختیار کرتا وہ مذہب اور ذات پات کی تفریق سے مبرا ہو جاتا اور دائرے کے سب لوگ برابری اور بھائی چارے کی لڑی میں پروئے جاتے۔

ایک نامور تاریخ داں میر علی شیر قانع کے مطابق صوفی عنایت اللہ نے علم اور سچائی

کی تلاش میں دور دور تک سفر کئے تھے انہوں نے جنوبی ہندوستان میں بیجاپور کے مقام پر چند سال شاہ عبدالمالک کی صحبت میں گزارے اور اس کے بعد وہ دہلی چلے آئے جہاں شاہ غلام محمد کی صحبت میں ظاہری علوم حاصل کئے نتیجہ کے طور پر استاد اور شاگرد میں اس قدر رابطہ بڑھا کہ بالآخر استاد بھی ان کے ہمراہ ٹھٹھہ چلے آئے۔ شاہ غلام محمد طریقت کو شریعت پر ترجیح دیتے تھے اور مذہبی رسومات پرستی پر نیک عمل کو فوقیت دیتے تھے اس لئے ٹھٹھہ میں جلد ہی درباری اور پیشہ ور رسمی علماء ان کے خلاف ہو گئے اور ٹھٹھہ کی شرعی عدالت میں ان پر مقدمہ قائم کر دیا گیا شاہ عنایت اللہ نے اپنے استاد سے درخواست کی وہ دہلی واپس لوٹ جائیں کیونکہ ان کی جان کو خطرہ تھا جب کہ صوفی خود میرن پور جھوک چلے آئے جہاں ان کے اجداد کی معاوضہ معافت درگاہی زمین تھی۔

اس زمانہ کا سندھ دو حصوں میں بٹا ہوا تھا یعنی بالائی سندھ جس کا دارالخلافہ بھکر (سکھر) تھا اور نچلا سندھ ٹھٹھہ کے ماتحت تھا اور زیریں سندھ اس زمانہ میں چوتھی سرکار کے طور پر صوبہ ملتان کا حصہ تھا جو کہ مغلوں کے حکم پر 1679ء میں میاں یار محمد کلہوڑہ کے زیر تسلط تھا۔

اسی طرح نچلا سندھ بھی چار سرکاروں پر مشتمل تھا جو کہ ٹھٹھہ چھاچھ کان، نصرپور، اور چاکر ہالا کے نام سے مشہور تھیں اور جو صوفی عنایت کی شہادت کے واقعہ کی بناء پر یار محمد کلہوڑہ کے قبضہ میں آئیں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب سلطنت مغلیہ زوال پذیر ہو چکی تھی اور مرہٹہ، سکھ، اور راجپوت بغاوتوں نے اس کی کمر توڑ دی تھی اورنگزیب کی موت کے ساتھ اس کے عروج کا سورج غروب ہو چکا تھا اور اب دہلی کا نیا مغل بادشاہ فرخ سیر اس کے مزید بکھر جانے کے عمل کو نہیں روک سکتا تھا اس طرح سندھ جیسے دور دراز علاقوں میں مطلق العنانیت اور جاگیردارانہ لاقانونیت کا دور دورہ تھا نوابین، جاگیردار، پیر اور سید زمینداروں نے کسانوں کی لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کر رکھا تھا ان ناسامعد حالات میں صوفی عنایت اللہ نے آس پاس کے کچلے ہوئے کسانوں کو ایک دائرے میں جمع کرنا شروع کر دیا اور اپنی درگاہ کی کل زمین مساویانہ محنت اور فصل کی پیداوار کی بنیاد پر کسانوں میں مفت تقسیم کر دی اور درگاہ کے لنگر کے لئے ضرورت کے مطابق کٹوتی مقرر کر دی اس لنگر پر دائرے کے تمام لوگ مفت کھانا کھاتے تھے یہ ایک قسم کی کمیون تھی جس میں ہر کوئی اپنے حصہ کا کام کرتا اور اس کے مطابق ہی اس کا پیداواری حصہ ہوتا دائرے کے کسان فقیر کہلاتے اور یہ فقیر

جاگیرداری نظام کی بیشتر لعنتوں سے پاک تھے۔

جلد ہی صوفی عنایت کے دائرے کے کسان فقیروں کی کامیابی اور شہرت جنگل کی آگ کی طرح آس پاس کے کسانوں میں پھیلنے لگی بولڑی شاہ کریم جیسی ہزاروں ایکڑ کی مالک درگاہ کے مرید کسان بھی شاہ عنایت کے دائرے میں شامل ہونے لگے اور اڑوس پڑوس کے دیگر کسان بھی اپنے زمینداروں سے اسی قسم کی مراعات مانگنے لگے۔ اور اس طرح نچلے سندھ کا زمیندار طبقہ صوفی عنایت اللہ کی کسانوں میں پھیلتی ہوئی مقبولیت کو ایک سنگین خطرہ تصور کرنے لگا نتیجہ کے طور پر علاقے کے بڑے بڑے زمیندار صوفی کے خلاف سازش تیار کرنے میں مصروف ہو گئے۔ ان سازشی زمینداروں میں بولڑی شاہ کریم کے سید عبدالواسع، شیخ سراج الدین (بہاؤ الدین ذکریا مکتب) بابو پلیجانی کا نور محمد پلیجو، حمل بن لاکھو جاٹ اور دیگر بااثر زمیندار پیش پیش تھے انہوں نے ٹھٹھہ کے صوبے دار میر لطف اللہ خان کو درخواست پیش کی کہ سرکاری حکم نامے کے تحت جھوک کے شاہ عنایت اللہ کو اجتماعی یا اشتراکی زراعت سے روکا جائے۔ چونکہ جھوک کی درگاہی زمین دہلی سے بلامعاوضہ عطا ہوئی تھی اس لئے قانونی طور پر ٹھٹھہ کے صوبے دار کی دسترس سے باہر تھی۔ مگر صوبے دار نے زمینداروں کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا کہ وہ اپنے طور پر شاہ عنایت سے نبٹ سکتے ہیں۔

ٹھٹھہ سے ہری جھنڈی پا کر زمینداروں نے جھوک پر حملہ کر دیا گو کہ فقیر کسانوں نے بڑی بے جگری سے مقابلہ کرتے ہوئے زمینداروں کا حملہ پسپا کر دیا مگر بہت سے فقیر کام آئے کیونکہ ان کے پاس کسی قسم کا اسلحہ نہ تھا۔ مرنے والوں کے لواحقین نے دہلی میں فرخ سیر کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا فرخ سیر نے حملہ کے مجرم زمینداروں کو دہلی کی عدالت میں پیش ہو کر صفائی پیش کرنے کا حکم دے دیا نتیجہ کے طور پر شاہی عدالت میں سزا پانے کے خوف سے بیشتر متعلقہ زمیندار روپوش ہو گئے اور بادشاہ نے حکم دیا کہ مجرموں کی زمین چھین کر مرنے والوں کے وارثوں میں تقسیم کر دی جائیں۔ اس سے جھوک کے فقیروں کے حوصلے مزید بلند ہو گئے اور دائرہ مضبوط ہو گیا اب آس پاس کے زمینداروں کے ستائے ہوئے کسان پناہ اور مدد کی غرض سے شاہ عنایت اللہ کے گرد جمع ہونے لگے۔

اس مقام پر زمینداروں نے کوشش کر کے ٹھٹھہ کے صوبے دار میر لطف اللہ خان کی بدلی کروا دی کیونکہ ان کے مطابق وہ بہت نرم دل حاکم تھا اور ان کی جگہ نواب اعظم خان کو ٹھٹھہ کا نیا صوبے دار بنایا گیا جو کہ صوفی عنایت اللہ اور ان کے فقیروں کا جانی دشمن

تھا۔ سندھ کے زمینداروں' پیروں' سیدوں اور ملاؤں نے مل کر شاہ عنایت اللہ کے خلاف کفر کا فتویٰ جاری کروا کے پھر سے تحریک شروع کر دی مگر ہالا کے مخدوم خاندان نے شاہ عنایت کے خلاف اس تحریک میں حصہ لینے سے صاف انکار کر دیا۔

کفر کے فتویٰ کا سہارا لے کر نواب اعظم خان نے شاہ عنایت اللہ پر بادشاہ کے خلاف بغاوت اور آزادی کا الزام لگایا اور بادشاہ فرخ سیر کو ان کے خلاف بھڑکایا بادشاہ فرخ سیر نے بلا تحقیق کروائے نواب اعظم خان کو حکم دیا کہ صوفی اور اس کے فقیروں کو تلوار کے زور پر زیر کیا جائے۔

پھر کیا تھا' دہلی سے شاہی فرمان حاصل کرنے کے بعد اعظم خان نے جھوک پر ایک بڑے حملے کا منصوبہ بنایا زمینداروں کی فوج کی کمان کے لئے بھکر کے میاں یار محمد کلہوڑہ کو دعوت دی گئی اور اس طرح جھوک کے فقیروں کی ایک چھوٹی سی پرامن اور نہتی ٹولی کو ریاست کی مسلح فوجوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا۔

میدان جنگ سے ملتان کے میرون سنگھ کھتری کے نام میاں یار محمد کلہوڑہ کے ایک خط سے پتہ چلتا ہے کہ جھوک کا محاصرہ 12 اکتوبر 1717ء کو شروع ہوا گو ٹھٹھہ کے نواب اعظم خان کی فوج چھوٹی سی تھی مگر اصل جنگ میاں یار محمد کلہوڑہ کی فوجوں اور صوفی فقیروں کے درمیان ہوئی۔ صوفی فقیر زیادہ تر کلہاڑیاں' برچھوں' ٹوکوں سے مسلح تھے اور پہلی ہی رات دشمن کا گھیرا توڑ کر بڑی دلیری سے کلہوڑہ فوجوں کے عقب میں شب خون مارا جس میں چند ایک نامی گرامی زمیندار مارے گئے ان ہلاک ہونے والوں میں قاسم ولد گوہرام' ٹھٹھہ کا سید بولھو وکیل اور احمد بوبکانی شامل تھے جن کا ذکر یار محمد کلہوڑہ نے میدان جنگ سے اپنے بیٹے کے نام لکھے ہوئے ایک خط میں کیا ہے۔

اس طرح صوفی عنایت اللہ کے فقیروں نے دشمن کی بھاری فوج کے خلاف دفاعی جنگ کے ذریعہ مقابلہ شروع کیا فقیر دن بھر دفاعی جنگ کے ذریعہ کلہوڑہ فوج کی پیش قدمی روکے رکھتے اور رات کے اندھیرے میں درگاہ سے نکل کر دشمن کی صفوں میں گھس کر شب خون مارتے اور دشمن کے ہتھیار بھی چھین لاتے۔ دو ماہ اسی طرح گزر گئے مگر زمیندار اور ان کی کرائے کی فوج زیادہ تعداد اور بہتر ہتھیار سے لیس ہونے کے باوجود جھوک کے فقیروں کو زیر کرنے میں ناکام رہی۔

میر علی شیر قانع کے مطابق صوفی فقیروں کے پاس سوائے اس کے اور کوئی راستہ ہی نہ تھا کہ وہ گوریلا جنگ کے ذریعہ اپنا دفاع کرتے یا پھر ختم ہو جاتے اس طرح چار ماہ کی

محصوری کے باوجود فقیر دشمن سے ہتھیار چھین کر مضبوط ہوتے چلے گئے آٹھ ماہ ہونے کو آئے اور حملہ آور فوج کا حوصلہ پست ہونے لگا اور جنگ کا پاسہ اب فقیروں کی طرف پلٹنے لگا۔

شکست اور مکمل تباہی سے بچنے کے لئے دشمن نے ایک نئی چال چلی جنوری 1718ء کو میاں یار محمد کلہوڑہ نے قرآن پر قسم کھا کر صوفی عنایت اللہ سے صلح کرنے کے لئے اپنے بیٹے محمد خان اور شہداد بلوچ کو پیش کش دے کر بھیجا فقیر جانبازوں نے صوفی عنایت اللہ کو صلاح دی کہ زمیندار منافق ہیں اور انہیں جاگیریں قرآن سے زیادہ پیاری ہیں لہٰذا ان پر بھروسہ نہ کیا جائے مگر صوفی عنایت کا نہ صرف قرآن پر یقین مکمل تھا بلکہ وہ اپنے فقیر مریدوں کا ناحق بہتا ہوا خون بھی روکنا چاہتے تھے لہٰذا امن کا معاہدہ کر کے جھوک کے دروازے کھول دیئے گئے اور صوفی عنایت اپنے ایک بھائی اور بھتیجے کے ہمراہ معاہدہ کی شرائط طے کرنے کے لئے یار محمد کلہوڑہ کے فوجی کیمپ میں بذات خود پہنچ گئے جہاں صوفی عنایت اللہ کو گرفتار کر لیا گیا اور قرآن پر قسم اٹھانے کے باوجود فوج نے جھوک میں گھس کر ایک اندازے کے مطابق پندرہ سے بیس ہزار تک مرید کسانوں کا بے دردی سے قتل عام کیا سات جنوری 1718ء کو صوفی عنایت اللہ ان کے بھائی اور بھتیجے کو سرعام پھانسی دے دی گئی اور اس کے بعد صوفی عنایت شہید کا سر کاٹ کر ٹھٹھہ میں اس کی نمائش کی گئی اور پھر دلی بھیج دیا گیا بعد میں کچھ مزید فقیر اسے واپس جھوک لائے اور اس کے شریر کے ساتھ دفن کیا اور اس طرح کلہوڑوں نے ہزاروں کسانوں کے خون سے ہولی کھیلی نچلے سندھ پر بھی اپنا تسلط قائم کر لیا اور اس طرح پورا سندھ ان کی حکمرانی میں آ گیا۔

بارہ نومبر 1984ء کو میں جھوک پہنچا جو ٹنڈو محمد خان۔ سجاول روڈ پر واقع ہے وہاں میری ملاقات شکار پور کے ایک بزرگ فقیر امام الدین ڈھکن سومرو کے ساتھ ہوئی جنہوں نے صوفی شہید کی جدوجہد اور قربانی پر تفصیلی روشنی ڈالی۔

درگاہ کے بڑے سے احاطے میں چند ایک فقیر انتہائی سوگ اور سنجیدگی کے عالم میں ایک دائرے میں سر جھکائے زمین پر بیٹھے تھے درگاہ اب بھی اسی حالت میں ٹوٹی پھوٹی اور خستہ حال نظر آتی تھی میں نے وہ کنواں بھی دیکھا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے فقیروں کی لاشوں کے ساتھ بھر دیا گیا تھا ایک نظر ڈالنے پر لگتا تھا کہ جیسے وہ درگاہ اب بھی ماضی کے تاریخی دھندلکے میں محصور تھی۔

اس عظیم مجاہد کے عرس پر ایک ہو کا عالم تھا وہاں نہ تو کوئی غفور فقیر تھا اور نہ الن

فقیر اور نہ ہی کہیں سے عابدہ پروین کی کوک سنائی دی جھوک کی یہ چھوٹی سی درگاہ موجودہ شوگر مل کے سایہ میں جہاں ایک دن کلہوڑہ فوج خیمہ زن تھی اب بھی کھڑی سندھ کی تاریخ کا منہ چڑاتی نظر آتی ہے اور اہل بصیرت کے دلوں میں عبرت حاصل کرنے کے لئے روحانی منظر پیش کرتی ہے۔

شاہ لطیف نے اس کی ترجمانی یوں کی۔

"صوفی نے اپنے خون سے میرے وجود کے ورق کو دھو دیا اور تب ہی میں محبوب کی آنکھوں میں جھانکنے کی جسارت کر سکا۔"

خواب کی موت

ایلی ویزل کو 1986ء کا نوبل انعام دیا گیا۔ ویزل نے لڑکپن میں اپنے پورے خاندان کو آس وٹز (Auswitz) اور بوچن والڈ (Buchen wald) کے بدنام زمانہ خونی کیمپوں میں نازی جرمنوں کے ہاتھوں اپنی آنکھوں کے سامنے مرتے دیکھا تھا۔ اس نے اپنی پوری زندگی ظلم کے خلاف آواز اٹھانے پر صرف کر دی تھی۔

1986ء کے پاکستان کو بھی ظلم و جرائم، قتل و غارت گری، فرقہ وارانہ گروہی سیاست اور سماجی تباہی کے لئے طویل عرصہ تک یاد رکھا جائے گا۔ اس سال کو اگر ضیاء کی طویل آمرانہ دور حکومت کا نقطہ عروج کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ سندھ کے شہروں اور دیہات کو خون میں نہلا دیا گیا۔ لوگ قانون نافذ کرنے والی ایجنسیوں اور ڈاکوؤں میں تمیز کرنا بھول گئے۔ چوری اور ڈاکہ زنی جو اب سندھ کے شہروں اور دیہاتوں میں ثقافت کا درجہ حاصل کر چکی ہے اس کی بنیاد اسی سال میں رکھی گئی۔ افغانستان کی جنگ کی آڑ میں منشیات اور کلاشنکوف کلچر کی ابتدا اسی دور میں ہوئی۔ جنرل ضیاء کے دور حکومت کو پاکستانی معاشرے کے خاتمے کی ابتداء کہا جائے تو بیجا نہ ہو گا۔ خاص طور پر کراچی اور حیدر آباد میں جو قتل و غارت گری پھیلائی گئی وہ وہاں کے بے بس اور بے گناہ عوام کے دلوں پر ہمیشہ کے لئے عدم تحفظ کے احساس کی مہر ثبت کر گئی۔

جیسا کہ یہ سب کچھ کافی نہ تھا۔ اسی سال سندھ کے دو سپوت کراچی میں فرخ امین اور حیدر آباد میں عارب شیدی بھی ہمیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر چلے گئے وہ دونوں ہی نوجوان تھے اور اپنے ملک اور اس کے مستقبل کے لئے ان گنت خواب اپنے دل میں سموئے ہوئے تھے دونوں ہی نے اپنے مثبت نظریات کی خاطر بہت دکھ جھیلے تھے۔ سب سے عجیب بات یہ تھی کہ دونوں ہی سرطان جیسے موذی مرض کا شکار ہوئے۔

حیدر آباد کے قرب و جوار میں میرانی کی گوٹھ میں پیدا ہونے والا عارب شیدی اپنے مغربی افریقی شکل و شباہت کے ساتھ مضبوط گٹھے کا دیو پیکر انسان تھا۔ وہ کالے سمسن کی طرح قوی ہیکل مگر نہایت ہی نرم مزاج اور فرشتہ دل شخصیت کا حامل تھا۔ وہ سندھ کے

دیگر شیدیوں کی طرح غربت و افلاس بھری دنیا میں پیدا ہوا اسے اس بات کا شدید احساس تھا کہ اس کے اجداد غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ایک دن افریقہ سے لائے گئے تھے اور یہ کہ اب بھی ان کی حالت دور غلامی کے ماحول سے زیادہ مختلف نہیں تھی۔

اسی سال میں اپنے کھیتوں میں پانی دیتے ہوئے عارب شیدی کو سانپ نے ڈس لیا تھا مگر زہر کا کڑوا گھونٹ پی کر وہ ہنستے ہوئے زندہ رہا۔ "سانپ بھی کیا یاد کرے گا کہ اسے کس شیدی سے پالا پڑا ہے۔" وہ اکثر ہنس کر کہتا مگر سرطان کے موذی مرض نے پہاڑ جیسے عارب کو دیکھتے ہی دیکھتے ختم کر دیا اور پھر چاروں طرف شہروں اور دیہاتوں میں منڈلاتی ہوئی سماجی موت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا وہ حوصلہ چھوڑ گیا مگر ورثے کے طور پر دوستوں اور ساتھیوں کے دلوں میں انسانی خلوص اور محبت کی جوت جگا گیا۔

فرخ امین کے لوگ تقسیم ہند کے وقت دہلی سے کراچی چلے آئے تھے اس کے والد کے دفتر خارجہ سے متعلق ہونے کی وجہ سے فرخ کی اعلیٰ تعلیم ترکی' برطانیہ اور کیناڈا کی میک گل یونیورسٹی میں ہوئی تھی۔ وہ پیشہ کے اعتبار سے انجینئر بھی تھا اور ایم۔ بی۔ اے بھی اور مانٹریال کے شہر میں اسے جدید اور ترقی یافتہ زندگی کی تمام سہولتیں میسر تھیں جہاں وہ ایک تعلیمی ادارے میں پڑھاتا تھا۔ مگر اس کے حساس دل میں اپنے ملک اور اس کے ترقی پذیر لوگوں سے دور رہنے کے احساس جرم نے اسے چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ لہٰذا 1981ء میں اس نے مغربی دنیا کی سب آسائشیں چھوڑ کر وطن کی غربت اور محرومیوں کو گلے لگا لیا۔ ابتداء میں اس نے کراچی یونیورسٹی میں پڑھانا شروع کیا۔ وہ پھر سندھ کے ھاریوں کے ساتھ رشتہ قائم کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ سندھ کے ھایوری دنے بھی اپنی روایتی فراخ دلی کے ساتھ اس کا آدر مان کیا کبھی چاندنی اور کبھی اندھیری راتوں میں سندھی ھاریوں کی قربت میں وہ منزل سے کتنا قریب اور خوش تھا اسے یوں لگا جیسے اس نے زندگی میں نیا جنم لیا ہو۔ تحفظ کے ایک نئے احساس نے اس کے حوصلے بلند کر دیئے اور اس نے شادی بھی کر لی وہ ایک نئی نسل پیدا کرنے کا خواہاں تھا۔

مگر اس کے مقدر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ جیسے جیسے اس کے ذہن نے ترقی کی' اس کے جسم کے کیمیائی عمل نے کام چھوڑ دیا اور اس کا جسم دیکھتے ہی دیکھتے بکھرنے لگا ڈاکٹروں نے اس کی بیماری کو خونی سرطان بتلایا مگر اس نے آخری دم تک امید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور وہ آخری وقت تک اپنے کام میں مگن رہا۔

فرخ امین انتہائی مخلص سادہ اور منکسر مزاج انسان تھا اور خاکساری تو گویا اس میں

کوٹ کوٹ کر بھری تھی مگر عارب شیدی کی طرح فرخ بھی بے حد حساس۔ نرم دل اور پرامن واقع ہوا تھا۔ گو عارب شیدی کی طرح اس کا دل بھی اپنے بدحال.لوگوں کی نجات کے لئے انقلابی نظریات کا حامل تھا مگر عارب شیدی ہی کی طرح فرخ کا مرض بھی لاعلاج تھا۔

یہ 1986ء کے آخری دنوں کا ذکر ہے جب یکلخت کراچی میں آگ اور خون کی ہولی کھیلی جانے لگی اس نے انسانی سنگدلی اور جرائم کے دل ہلا دینے والے واقعات سنے اس نے لوگوں کو جنونی کیفیت میں ایک دوسرے کو یوں قتل کرتے دیکھا جیسا کہ اس نے 1947ء اور پھر بنگال میں 1971ء کے بارے میں سنا تھا انسانی پیار کا وہ تصور جو اس نے سالہا سال اپنے من میں بنا تھا کچے دھاگے کی طرح یکلخت ٹوٹنے لگا اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ انسان کے اندر کس قدر وحشت چھپی ہوئی ہے اکتوبر انقلاب کی برسی کے دن اس کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا وہ کتنا خوش تھا "شگون برا نہیں!" اس نے مجھ سے ہنستے ہوئے کہا۔

مگر کراچی میں خون کی ہولی پھیلتی ہی چلی گئی اور جب کراچی کے لوگ بڑی بے دردی کے ساتھ ایک دوسرے کی ہتیا کر رہے تھے وہ چپکے سے انہی دنوں اس شہر کی تمام تر بدصورتیوں سے منہ موڑ کر چلتا بنا۔

1986ء کے قہر آلود سال میں فرخ امین اور عارب شیدی کی بے وقت موت کو ایک خواب کی موت کہا جا سکتا ہے۔ 1947ء کی خونی تقسیم کے بعد پاکستان کی کل تاریخ ایک طویل اور خوفناک رات کی مانند رہی ہے جس میں امید اور روشنی کی ایک کرن تک نہ ابھر سکی۔ یوں بھی خواب اور حقیقت کا کیا میل خواہ وہ خواب اقبال کا ہو یا محمد علی جناح کا۔ جو لوگ اپنی صدیوں طویل جڑوں کو پل بھر میں ٹھکرا دیں اور ماضی کی تاریخ پلک جھپکتے میں بھلا ڈالیں فطرت ان لوگوں کا یہی حشر کرتی ہے مگر فرخ امین اور عارب شیدی ہماری ان اجتماعی سماجی گراوٹوں اور غلاظتوں سے اپنی روح کا دامن صاف بچا کر نکل گئے ایلی ویزل نے کیا خوب کہا۔

"میں انسانیت پر ایمان کھو چکا ہوں، پھر بھی ایمان کا ہونا ضروری ہے۔ مجھے کسی زبان پر یقین نہیں پھر بھی زبان ضروری ہے۔ میں کسی خدا پر اندھا ایمان نہیں رکھتا۔ پھر بھی خدا ضروری ہے۔"

ہمیں لوگ نہیں زمین چاہئے

مانٹریال (کینیڈا) کی میک گل یونیورسٹی میں میرے مذکورہ لیکچر کے بعد بنگلہ دیش کے ایک صحافی جس کا تعلق چٹاگانگ ہل ٹریکٹ کے چکما قبیلے سے تھا میرا انٹرویو کرنے کی درخواست کی۔

"کیا تمہیں یاد ہے کہ کچھ عرصہ قبل ہم ایک ہی ملک کے باشندے تھے؟" چکما صحافی نے جو اپنا نام ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا مجھ سے بڑی مانوسیت کے ساتھ پوچھا۔ "ہاں میں نے کہا" مشرقی پاکستان مجھے اچھی طرح یاد ہے مگر مجھے یہ بھی ابھی نہیں بھولا ہے کہ ایک دن بھارت کے لوگ اور ہم بھی تو ایک ہی ملک کے باشندے تھے۔" میں نے شرم کے مارے نظریں زمین میں گاڑتے ہوئے کہا۔

"انسان کی یادداشتیں کتنی سطحی ہوتی ہیں؟" اس نے فکرمند لہجے میں بولتے ہوئے کہا۔ "جو سلوک پاکستانی فوج نے بنگال کی خانہ جنگی کے دوران بنگالیوں سے روا رکھا تھا۔ اب وہی سلوک بنگالی فوج چکما لوگوں کے ساتھ کر رہی ہے۔"

"درمیانہ طبقہ کی قوم پرستی اکثر اوقات فسطائیت کو جنم دیتی ہے۔" وہ خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد بجائے یہ کہ وہ میرا انٹرویو کرتا میں نے اس سے پوچھا۔

"کیا تم بنگلہ دیش میں چکما لوگوں کی مشکلات کے بارے میں تفصیل سے بتلاؤ گے؟ تاکہ میں ان کو پاکستان کے عوام تک پہنچا سکوں۔"

اس کے بعد اس نے چکما لوگوں کی جدوجہد کے بارے میں کچھ ضروری کاغذات میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا "تفصیل تو خاصی لمبی ہے۔ تم اس میں سے جو ضروری سمجھو نوٹ کر لو اور اپنے لوگوں کو ضرور بتلاؤ تاکہ وہ اگر ہماری مدد نہ بھی کر سکیں تو عبرت ضرور حاصل کریں۔"

بنیاد

چٹاگانگ ہل ٹریکٹ بنگلہ دیش کے جنوب مشرق میں ہندوستان اور برما کی سرحدوں کے

ساتھ ساتھ پانچ ہزار تیرانوے (5093) مربع میل پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ چکما قبائیل کا قدیم اور روائتی علاقہ ہے۔ جس میں کوئی چھ لاکھ نفوس پر مشتمل چکما آبادی رہتی ہے۔ نسلی اعتبار سے چکما لوگ مشرقی ہندوستان کے دراوڑ اور برما کے منگول نما قبائل کا قدیم مرکب کہے جا سکتے ہیں۔ ان کی اکثریت بدھ مذہب سے تعلق رکھتی ہے۔ اور ان میں کچھ چھوٹے گروپ ہندوؤں اور عیسائیوں کے بھی ہیں۔ ان لوگوں کی اپنی مخصوص قدیم تہذیب۔ رسم و رواج اور مذاہب کے حوالے سے بعد کی نو آبادکار بنگالی اونچی ذات کے لوگوں نے قدیم زمانہ ہی سے اس دھرتی کے ان اصل باشندوں پر ظلم و ستم روا رکھا ہے۔ شاید اس کا اصل مقصد ان کو بے دخل کر کے ان کی زمین ہتھیانا تھا۔

انگریزی دور

جب انگریزوں نے یہ علاقہ فتح کیا تو انہوں نے چکما قبائل کی گو پیچیدہ مگر پرامن بود و باش کو دیکھتے ہوئے اس علاقہ کو چٹاگانگ ہل ٹریکٹ ریگولیشن (1900) کی رو سے اسے خود مختاری کا درجہ دے دیا اور اس طرح ایک انگریز ڈپٹی کمشنر اور چند ایک دوسرے انگریز افسروں کی ماتحتی میں یہ قبائل اپنا کام کاج خود چلاتے رہے۔ یہاں تک کہ اس علاقہ کی پولیس بھی چکما لوگوں سے ہی بھرتی کی جاتی تھی اور غیر قبائلیوں کو اس علاقہ میں مستقل طور پر رہائش پذیر ہونے کی اجازت نہیں تھی اور نہ ہی وہ قبائلی علاقہ کی زمین خرید سکتے تھے۔

کپڑے بننے کا فن چکما لوگوں میں بہت قدیم زمانہ سے مقبول تھا۔ مگر ان کی اکثریت دریائی وادیوں میں کھیتی باڑی کر کے اپنا پیٹ پالتی تھی۔ ریونیو کا محکمہ کلی طور پر قبائلیوں کے ہاتھ میں تھا۔ مگر انگریز انتظامیہ نے رنگامتی کے مقام پر ایک بہت بڑا زراعتی ادارہ قائم کیا تھا جو لوگوں کو جدید زراعت سے روشناس کرانے کے ساتھ ساتھ رنگامتی ہائی اسکول میں زراعت کو مضمون کے طور پر پڑھانے کا بندوبست بھی کیا تھا۔

پاکستانی دور

1947ء میں تقسیم ہند کے موقع پر سر سیرل ریڈ کلف نے جو بونڈری کمیشن کا چیئرمین تھا یہ علاقہ پاکستان میں شامل کر دیا جبکہ تقسیم سے قبل اس علاقہ میں چکما قبائل کی آبادی 98% فی صد غیر مسلموں پر مشتمل تھی۔ گو قانون کی رو سے محض مسلم اکثریتی علاقوں کو پاکستان میں شامل کرنا تھا اور اس فیصلہ کے خلاف چکما قبائل نے شدید ناپسندیدگی کا اظہار

بھی کیا تھا۔ پاکستانی دور حکومت میں 1900ء کے چٹاگانگ ہل ٹریکٹ کے قانون کو بالائے طاق رکھ کر نہ صرف یہ کہ بنگالی مسلمانوں کو یہاں مستقل طور پر بسنے کی اجازت دے دی گئی بلکہ انتظامیہ کا نظم و نسق بھی اب چکما قبائل کی بجائے پاکستانی افسروں کے ہاتھ میں دے دیا گیا جن کی اکثریت بنگالی تھی۔ پھر کوئی اگلے چوبیس سالوں میں حکومت پاکستان نے ایک ایک کر کے ان کے تمام خودمختارانہ حقوق چھین لئے۔ چکما لوگوں کی قبائلی پولیس کو معطل کر دیا گیا۔ اور اس کے بعد بنگالی نو آبادکاروں نے اب چکما قبائل کے سماجی اور مذہبی اختیارات میں دخل اندازی کرنا شروع کر دی۔ مثال کے طور پر 1953ء میں چکما راجہ ٹریڈیو رائے کو بنگالی انتظامیہ نے اس وقت حراست میں لے لیا جب وہ قبائلی عدالت کے فیصلے نمٹانے میں مشغول تھا۔ اس کے بعد اس علاقہ میں بنگالی نو آبادکاروں کو زمین کے پروانے دے کر کوئی ایک لاکھ قبائلیوں کو اپنی آبائی زمین سے بیدخل کر دیا گیا۔ 1961ء بنگالی نو آباد کاروں نے بلوہ کر کے مزید ساٹھ ہزار قبائلیوں کو بے دخل کر کے ہندوستان ور برما کی سرحد پار دھکیل دیا جن میں سے کسی کو بھی واپس آنے کی اجازت نہیں دی گئی۔

اس واقعہ کے فوراً بعد جب امریکی امداد کے تحت کرنافلی دریا پر ہائیڈرو الیکٹرک ڈیم بنایا گیا تو چکما قبائلیوں کا تین سو پچاس (350) مربع میل زرخیز زراعتی علاقہ کو جھیل کے پانی میں غرق کر دیا گیا۔ اس طرح چکما قبائل کی کل زرخیز زمین کا کوئی چالیس فیصد حصہ کو تباہ کر کے مزید ایک لاکھ قبائلی کسانوں کو زراعتی روزگار سے محروم کر دیا گیا۔ اس جبری بے دخلی کے دوران بہت سے قبائلی مزاحمت کرتے ہوئے ہلاک ہوئے اور بقیہ کو تری پورہ اور میزورام سرحد کی طرف ہندوستان میں دھکیل دیا گیا۔ اس پروجیکٹ کے فوائد کے طور پر کرنافلی پیپر مل' اور چندرا گھونا ریال ملز قائم ہوئیں جس میں چکما قبائل کا کوئی حصہ نہ تھا۔

بنگالی دور

1971ء کی خانہ جنگی کے دوران چٹاگانگ اور نواکھلی کے اضلاع سے کوئی پچاس ہزار بنگالی مسلمان پاکستانی فوج کی مدد سے اس زرخیز قبائلی زمین پر قابض ہوئے اور بنگلہ دیش کے قیام کے بعد انہوں نے واپس جانے سے انکار کر دیا۔ نہ صرف یہ بلکہ ان بنگالی نو آباد کاروں نے قبائلی لوگوں پر حملے کئے۔ ان کے گھربار جلائے۔ عورتوں کی عصمت دری کی اور بدھ عبادت گاہوں کی بے حرمتی کی۔ حقیقت میں خانہ جنگی کے دوران چکما قبائلیوں کو پاکستانی فوج اور بنگالی لوگوں دونوں ہی کے ہاتھ نقصان اٹھانا پڑا۔ مثال کے طور پر جب

پنچیری کے علاقے سے پاکستانی فوج پسپا ہوئی تو بنگلہ دیش کی مکتی باہنی فوج آ دھمکی اور انہوں نے قبائلیوں کا قتل عام کیا۔ 14 دسمبر 1971ء کو بنگالی سپاہیوں نے کو کیچری کی بستی میں آگ لگا کر ان کے دو سو گھر جلا دئے اور چالیس قبائلیوں کو ہلاک کیا اور اس کے بعد وقتاً فوقتاً ان پر پاکستانی فوج کی مدد کرنے کے الزام میں زیادتیاں ہوتی رہیں۔ آزاد بنگلہ دیش میں جب شیخ مجیب کی حکومت قائم ہوئی تو چٹاگانگ پہاڑی سلسلہ میں خون کی ہولی کھیلی گئی اور رضاکاروں اور البدر کے حمایتیوں کی تلاش کے بہانے سینکڑوں بے گناہ قبائلیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ان کے گھروں کو لوٹ کر آگ لگا دی گئی اور بے شمار قبائلی عورتوں کی بے حرمتی کی گئی۔ 1972ء میں بنگلہ دیشی فوج کے سپاہیوں نے میرونگ۔ ہزا چاری اور بول کھلی کے گاؤں میں لوگوں کا بے دریغ قتل کیا۔

شیخ مجیب کے دور میں بنگالی لوگوں کی ایک بڑی تعداد کو قبائلیوں کی زمین چھین کر مستقل طور پر وہاں بسایا گیا۔ یہ کام حکومت کی ایک سوچی سمجھی پالیسی کے تحت کیا گیا تاکہ چکما قبائلیوں کو ان کے اپنے علاقہ میں اقلیت میں تبدیل کیا جا سکے۔ بنگالی نو آباد کار تقسیم کے وقت دو فیصد تھے جو اب چالیس فیصد ہو چکے تھے۔ شیخ مجیب کا تختہ الٹنے کے بعد بھی چکما قبائل کی زندگیوں پر کوئی فرق نہیں پڑا۔ 1976ء میں جنرل ضیاء الرحمٰن کی فوجوں نے بھی قبائلی علاقہ میں قتل و غارت گری کا بازار گرم رکھا۔ اور بقول چکما عوام کے کہ بنگلہ دیشی فوجوں نے چکما قبائل پر جو ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے ہیں اس نے پاکستانی فوج کے مظالم کو بھی مات کر دیا۔

اتفاق سے 25 مارچ 1980ء کو بنگلہ دیش کے ایک فوجی کمانڈر نے کلام پتی یونین کے مقام پر چکما قبائل کی بحالی اور حفاظت کے سلسلہ میں کاؤکھلی بازار کے ایک بڑے میدان میں انہیں جمع کیا۔ جیسے ہی فوجی کمانڈر وہاں سے گیا۔ سینکڑوں بنگالیوں نے ہتھیاروں سے لیس ہو کر مجمع پر ہلا بول دیا جن کی پشت پناہی فوج کر رہی تھی۔ کوئی تین سو قبائلی جائے واردات پر ہی کام آئے۔ ان کی عورتوں کو اغوا کر لیا گیا۔ اور بدھ بھکشوؤں کا بھی یہی حشر ہوا۔ آج کل اس علاقہ میں بنگلہ دیش کی حکومت نے ہر پانچ قبائلیوں پر ایک فوجی تعینات کر رکھا ہے۔ اور چٹاگانگ ہل ٹریکٹ ایک بہت بڑا فوجی اڈا دکھائی پڑتا ہے۔

اس علاقہ میں بے لگام فوجی مہموں کے نتیجہ میں بڑے پیمانے پر حقوق انسانی کی پامالی کی گئی ہے۔ بغیر مقدمہ چلائے لوگوں کو حراست میں لینا۔ لوگوں کی نقل و حرکت پر پابندی۔ اشیائے خوراک کی ناکہ بندی۔ مذہبی رسومات کی بے حرمتی اور پورے پورے گاؤں کی ناکہ

بندی کرتے ہیں اور پھر مردوں عورتوں اور بچوں کو گھیر کر جمع کیا جاتا ہے۔ پھر مردوں کو گولی مار دی جاتی ہے اور عورتوں اور بچوں کی بے حرمتی کی جاتی ہے۔ نتیجہ کے طور پر سینکڑوں خاندان بھاگ کر جنگل میں پناہ لینے پر مجبور ہوتے ہیں اور جڑی بوٹیاں اور پتے کھا کر گزارا کرتے ہیں۔ ابھی تک بنگلہ دیش کی تمام حکومتوں نے چکما قبائل کے ساتھ یہ وحشیانہ سلوک جاری رکھا ہے۔

جنرل ارشاد کی موجودہ حکومت نے بھی اسلام کے نام پر چکما قبائل کی قتل و غارت گری میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے۔ ملٹری جنتا نے اب چکما قبائل کو جبری طور پر مسلمان بنانے کا ایک خفیہ منصوبہ بنایا ہے۔ اس کام کے لئے ہل ٹریکٹ کے دارالخلافائی شہر رنگامتی میں ایک بہت بڑا اسلامی تبلیغی مرکز قائم کیا گیا ہے۔ سعودی عربیہ کی مالی مدد کے تحت یہاں ایک بہت بڑی مسجد اور اسلامی ثقافتی مرکز بھی تعمیر کیا جا رہا ہے۔

26 مئی 1979ء کو پنچیری کے مقام پر بریگیڈیئر حنان اور لیفٹیننٹ کرنل سلام نے ایک بہت بڑی پبلک میٹنگ میں سرعام یہ اعلان کیا۔

"ہمیں یہاں کی زمین درکار ہے۔ یہاں کے لوگ نہیں!"

قارئین کو اگر یاد ہو تو ایک دن مشرقی پاکستان میں 1971ء کی خانہ جنگی کے دوران یہی الفاظ جنرل ٹکا خاں سے منسوب کئے گئے تھے جو انہوں نے بنگال کی سرزمین اور بنگالی لوگوں کے بارے میں کہے تھے۔ اور اب وہی الفاظ بنگال کی فوجی کمان نے چکما قبائل کی چھوٹی سی اقلیت کے لئے کہے ہیں۔ انسان کی یادداشت حقیقت میں کتنی سطحی اور گھٹیا ہوتی ہے! جو سلوک جرمن نازیوں نے یورپ کے یہودیوں کے ساتھ کیا۔ آج اسرائیلی فوجی وہی کچھ فلسطینوں کے ساتھ کر رہے ہیں۔ جو کچھ فرانسیسی اور امریکی نو آبادکاروں اور قابض فوجیوں نے ویٹنام کے لوگوں کے ساتھ کیا وہی کچھ ویٹنامیوں نے اپنی تیس لاکھ چینی اقلیت کے ساتھ کیا یا پھر کمبوڈیا پر قابض ہو کر وہاں کے لوگوں کے ساتھ کیا۔ غیر انسانی حد تک کچلی ہوئی تیسری دنیا میں ان واقعات کی فہرست بہت طویل ہے۔ ہر کوئی اپنے سے کمزور سماج پر چڑھ دوڑ کر حساب چکانے کی کوشش کرتا ہے۔ تنگ نظر علاقائی قوم پرستی ترقی پذیر ملکوں میں اب لعنت بنتی جا رہی ہے۔ کل کا مظلوم پلک جھپکتے میں آج کا نیا ظالم بن جاتا ہے۔ انسان ماضی سے کوئی سبق نہیں سیکھتا۔ اسی لئے اس کی زندگی میں قتل و غارت گری کا یہ سلسلہ ختم ہونے کو ہی نہیں آتا۔ ایک مشہور کہاوت ہے کہ۔ "جو لوگ اپنا ماضی بھلا دیتے

ہیں۔۔اس ماضی کو پھر سے دہرانا ان کا مقدر بن جاتا ہے۔ ”عین ممکن ہے کہ جو کچھ مشرقی پاکستان میں ہوا وہ ماضی قریب میں سندھ میں دہرایا جائے!“

امریکہ _ خواب اور حقیقت

مملکتیں راتوں رات نہیں بنتیں۔ اور نہ ہی پرامن تہذیبی دائرے میں رہ کر تعمیر کی جاتی ہیں۔ بلکہ ولندیزی یارک اور برطانوی انگلینڈ سے لے کر امریکہ کے نیویارک اور نیو انگلینڈ تک کی یہ نو آبادکار سلطنتیں قدیم اور دیسی باشندوں کی کھوپڑیوں کے ساتھ چنی گئی تھیں۔ اور کہیں کہیں تو نئی دنیا کے ان معماروں نے قدیم باشندوں کا سرے سے صفایا ہی کر دیا۔ مثال کے طور پر جب نو آبادکار دور میں یورپ کے چور چکار اور مہم جو باشندے آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ پہنچنے شروع ہوئے تو وہاں قدیم باشندے موجود تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے یورپی لوگوں کے امریکہ پہنچنے سے پہلے ریڈ انڈین لوگوں کی بستیاں چالیس ہزار سال سے وہاں وجود تھیں۔ اور آج آسٹریلیا میں بقول ان کے آدی واسی اور نیوزی لینڈ میں ماوری لوگ اور امریکہ میں ریڈ انڈین ڈھونڈنے سے ملتے ہیں۔ ان کی بیشتر آبادیاں یورپی لوگوں کی پانچ سو سالہ یلغاروں میں ایک ایک کر کے تباہ کر دی گئیں۔ مندرجہ ذیل صفحات میں مختصراً میں یہ بتلانے کی کوشش کروں گا کہ جدید امریکہ جسے وہاں کے لوگ ایک خوبصورت خواب کہتے ہیں وہ شرمندہ تعبیر کیسے ہوا۔ غالباً انسانی ذہن کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اس کی یادداشتیں خصوصاً ماضی کے حوالے سے بہت ہی سطحی ہوتی ہیں۔ اس ضمن میں پہلی۔ دوسری اور تیسری دنیا کی اصطلاحات نہ صرف مضحکہ خیز ہیں بلکہ نو آباد کار دور کے انسانی جرائم کے خلاف پردہ پوشی کے لئے گھڑی گئی ہیں۔

1974ء میں واشنگٹن ڈی۔ سی میں اریزونا (ARIZONA) کے لی رائے (LEROY) نامی اپاچی انڈین APPACHE INDIAN نوجوان اور اریگون (OREGON) کے چروکی انڈین CHEEROKI INDIAN) جم روبسن سے ملنے سے پہلے امریکہ کے ریڈ انڈین لوگوں کے بارے میں میرا تاثر وہی تھا جو میں نے جان وین JOHN WYNE کی ہالی ووڈ فلموں سے اخذ کیا تھا۔

"تمہیں ریڈ انڈین کیوں کہتے ہیں؟" میں نے ایک دفعہ لی رائے سے پوچھا۔ "ایک گورا احمق جسے تاریخ میں کولمبس کہتے ہیں ہندوستان کی تلاش میں یورپ سے نکلا اور راستہ

بھول کر ہمارے ملک میں آن پہنچا اور ہمیں ہندوستانی سمجھ بیٹھا اور تب سے اس کی گوری نسل ہمیں سرخ ہندوستانی کہہ کر پکارتی ہے۔" لی رائے نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

پندرہویں صدی کی آخری دہائی میں جب کرسٹوفر کولمبس سان سلواڈور کے ساحل پر اترا تو قدیم رسم رواج کے مطابق وہاں کے تینو (TAINO) انڈین لوگوں نے کولمبس اور اس کے ساتھیوں کا پرتپاک استقبال کیا اور انہیں تحفہ تحائف سے نوازا۔

"اتنے مہذب اور اتنے پرامن لوگ ہیں یہ۔" کولمبس نے ہسپانیہ کے بادشاہ اور ملکہ کے نام ایک خط میں لکھا۔ "میں حضور اعلیٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ان سے زیادہ بہتر قوم دنیا میں شاید ہی کوئی اور ہو۔ یہ لوگ اپنے پڑوسیوں سے اتنا ہی پیار کرتے ہیں جتنا اپنے آپ سے ان کی چال ڈھال میں بلا کی شان اور نرم مزاجی ہے اور ان کے ہونٹوں پر ہر وقت مٹھاس بھری مسکراہٹ کھیلتی رہتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ کپڑے لتے کا استعمال کم ہی کرتے ہیں پھر بھی ان کی آن بان اور بانکپن قابل ستائش ہے۔" کولمبس نے جزیرے پر پیر جمانے کے بعد اپنے میزبان انڈین لوگوں میں سے دس کو اغوا کر کے ہسپانیہ لے گیا تاکہ ان کو گورے لوگوں کی طرز زندگی اور زبان سکھا کر مزید فتوحات کے لئے استعمال کیا جا سکتا۔ ان میں سے بیشتر انڈین قید خانوں ہی میں مر گئے مگر مرنے سے پہلے پادریوں نے انہیں عیسائیت کا بپتسمہ دے دیا تھا۔ نتیجہ کے طور پر ان اولین انڈین لوگوں کے جنت وصل ہونے پر ہسپانیہ کے لوگ اتنے خوش ہوئے کہ اب انہوں نے یہ عمل کل جزائر غرب الہند میں اور تیز کر دیا۔

تینو (TAINO) اور اراوک (ARAWAK) انڈین نے یورپی مذہب میں تبدیلی کے خلاف کوئی خاص مزاحمت نہیں کی مگر جب ان جٹیل اجنبیوں نے سونے چاندی اور قیمتی پتھروں کی تلاش میں جزیرے کا کونا کونا چھاننا شروع کر دیا تو انڈین نے شدید مزاحمت کی۔ اس پر ہسپانیوں نے ان کے گاؤں کے گاؤں لوٹ کر جلا دئے۔ مردوں' عورتوں اور بچوں کو سینکڑوں کی تعداد میں اغوا کر کے غلام منڈیوں میں بیچ دینے کے لئے جہازوں میں بھر کر یورپ روانہ کرنا شروع کر دیا۔ اروک لوگوں کی مزاحمت پر یورپی نو آباد کار توپیں اور بندوقیں میدان میں لے آئے اور پورے پورے قبیلوں کو بھون کر رکھ دیا۔ نتیجہ کے طور پر 12 اکتوبر 1492ء کو کولمبس کے جزیرہ سان سلواڈور پر قدم رکھنے کے بعد کوئی ایک دہائی کے اندر اندر لاکھوں انڈین موت کے گھاٹ اتارے جا چکے تھے۔

اس واقعہ کے بمشکل ایک صدی بعد شانی سردار SHAWNEE CHIEF کی درد

بھری پکار سنائی دی۔

"آج پیکوئیٹ PEQUOT کیا ہوئے؟ اور نارا گانسیٹ (NARRAGANSETT) موہیکن (MOHICAN) پاکانوکیت (PAKANOKET) اور ہمارے لوگوں کے دوسرے طاقتور قبیلے کیا ہوئے؟ ہاں! وہ گورے لوگوں کے ظلم و استبداد کے سامنے یوں غائب ہو گئے جیسے گرمیوں کے تپتے سورج کے سامنے برف غائب ہو جاتی ہے۔ کیا ہم جدوجہد کئے بغیر' ایک ایک کر کے اپنے آپ کو یوں تباہ ہونے دیں گے؟ اور اپنے گھربار اور اپنی وسیع سرزمین جسے ہمیں قدرت نے بخشی تھی۔ غرضیکہ اپنے اجداد کی قبریں اور دیگر چیزیں جو ہمیں مقدس اور پیاری تھیں ان کے حوالے کر دیں گے؟ تو مجھے معلوم ہے تم چیخ چیخ کر کہو گے۔ نہیں۔ نہیں کبھی نہیں!"

مگر حقیقت میں انڈین لوگ برف کی طرح اچانک نہیں پگھل گئے۔ بلکہ ان کی اجتماعی موت اور تباہی کے پیچھے بہت طویل اور بھیانک داستان چھپی ہے۔ ان کو گورے لوگوں نے جھوٹ دغا' سازش' لالچ' خوفناک جنگوں اور اس کے نتیجے میں بے دریغ قتل عام کے ذریعہ صدیوں پر محیط مزاحمتی جدوجہد کے بعد ختم کیا۔ اس زمانہ میں دور دور تک پھیلے ہوئے قبائل کے درمیان رابطہ نہ ہونے کے برابر ہوتا تھا۔ لہٰذا گورے لوگوں کی ظلم و ستم اور بربریت کی اطلاعات ان کی نئی فتوحات اور نئی سیٹلمنٹ سے قبل دوسرے قبائل تک کم ہی پہنچ پاتی تھیں۔ اور نام نہاد تیسری دنیا کے عوام تک تو شاید آج تک بھی نہ پہنچ پائی ہوں۔ اس طرح ان قدیم اور پرامن باشندوں کا وحشی یورپی نو آباد کاروں کے ہاتھوں جو حشر ہوا مہذب دنیا اس سے آج تک ناآشنا ہے۔

مگر جب انگریزی بولنے والے گورے نو آبادکار 1607ء میں ورجینیا (VIRGINIA) پہنچے تو ان کی آمد سے قبل وہاں کے پوہاتن (POWHATAN) انڈین تک ہسپانوی نو آبادیوں میں دیسی لوگوں کے مہذب بنائے جانے کے طور طریقوں کے متعلق افواہیں پہنچ چکی تھیں۔ یہی کام انگریزوں نے کچھ نئے ڈھب سے کرنے کی سوچی۔ اور یوں بھی جیمز ٹاؤن (JAMES TOWN) کی بستی بسانے کے لئے انہیں کچھ عرصہ کے لئے امن کی ضرورت تھی۔ لہٰذا پوہاتن سردار واہون سوناکوک (WAHUNSONA COOK) کو بادشاہ کا لقب دے کر اسے اس بات پر مائل کرنے کی کوشش کی گئی کہ وہ اپنے لوگوں کو کھیتی باڑی کے کام میں جوت کر نو آبادکار انگریزوں کے لئے غلہ مہیا کرے۔ اور جب واہون سوناکوک اپنی باغی رعایا اور نو آباد کاروں کے درمیان تذبذب کا شکار ہوا تو جان رلفی (ROLFE

(JOHN) نے اس کی بیٹی پوکا ھو ہتہ (POCKA HONTA) سے شادی رچالی تاکہ انڈین سردار انہیں اپنا عزیز سمجھے۔ مگر سردار کی موت کے بعد پوہاتن انڈین بغاوت پر اٹھ کھڑے ہوئے اور انگریز نو آباد کاروں کو واپس سمندر کی طرف دھکیلنے کی کوشش کی جہاں سے وہ ایک دن آئے تھے۔ مگر انڈین لوگوں نے انگریزوں کے اسلحہ کی قوت کا غلط اندازہ لگایا تھا اور تھوڑے ہی عرصہ میں آٹھ ہزار پوہاتن لوگوں کا قبیلہ سکڑ کر ایک ہزار سے بھی کم بچ رہا اور باقی سب انگریزی توپوں اور بندوقوں کی نذر ہو گئے۔

ماسا چوسٹ انڈین (MASSA CHUSETT) کے علاقہ میں گو کہانی کی ابتدا قدرے مختلف تھی مگر ان کا انجام بھی وہی ہوا جو ورجینیا کے انڈین کا ہوا تھا۔ 1620ء میں انگریزوں کے جہاز پلے متھ (PLAY MOUTH) کے مقام پر لنگر انداز ہونے پر اگر دیسی انڈین ان کی کھانے پینے کے سلسلہ مین مدد نہ کرتے تو وہ تمام بھوکوں مر کر ختم ہو جاتے۔ ماسا چوسٹ انڈین پلے متھ کے نو آباد کاروں کو فطرت کے مظلوم بچے سمجھ کر اپنے قبیلے کے ذخیرہ سے ان کو اناج' غلہ دیا۔ انہیں دریاؤں سے مچھلیاں پکڑنے کے طریقے سکھلائے اور اس طرح ان کی سردیوں کے موسم میں زندہ بچ جانے میں پوری پوری مدد کی۔ جب بہار کا موسم آیا تو انڈین لوگوں نے ان کو مکی کا بیج فراہم کیا اور اسے کاشت کرنا سکھلایا۔

پھر کئی سال تک یہ انگریز نو آباد کار اپنے انڈین پڑوسیوں کے ساتھ پرامن زندگی گذارتے رہے۔ مگر پھر پرانی کہانی دہرائی جانے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے گورے لوگوں کے مزید سمندری جہاز یورپی لوگوں سے بھر بھر کر پہنچنے لگے۔ اور ہر طرف کلہاڑوں اور گرتے درختوں کی آواز پورے ساحل پر گونجنے لگی جس کو اب نو آباد کاروں نے نیو انگلینڈ (NEW ENGLAND) کہنا شروع کر دیا تھا اور سیٹلمنٹ پر سیٹلمنٹ بسانی شروع کر دی تھیں۔

1625ء میں کچھ نو آباد کاروں نے سردار ساموسٹ (CHIEF SAMOSET) سے مزید مراعات کی درخواست کرتے ہوئے پاما کوئڈ (PAMA QUID) لوگوں کی سرزمین سے بارہ ہزار ایکڑ مزید زمین حاصل کرنے کی درخواست کی۔ سامو سیٹ اور اس کے انڈین لوگوں کا ایمان تھا کہ زمین جو آسمان کی طرح وسیع ہے خدا کی ملکیت ہے اور اس پر تصرف کا ہر انسان کو ضرورت کے مطابق حق ہے۔ مگر یہ کسی فرد کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ مگر پھر بھی گورے نو آباد کاروں کے اصرار پر اس نے کاغذ پر اپنے نشانات بنا دئے۔ اور غالباً انگریز نو آبادکاروں کے حق میں انڈین زمین کے قانونی طور پر مالکانہ حقوق کی یہ پہلی دستاویز

تھی۔

مگر دوسرے نو آبادکاروں نے جو اب ہزاروں کی تعداد میں جوق در جوق پہنچ رہے تھے اس دستاویزی تکلف کو بھی ضروری نہیں سمجھا اور اب وہ انڈین زمین پر زبردستی قابض ہوتے چلے گئے۔ 1662ء میں جب وانمپانوگ (WAMPANOAG) انڈین کے عظیم سردار ماسا سوئیت (MASSASOIT) کا انتقال ہوا اس وقت انگریز نو آباد کار انڈین لوگوں کو اندرونی علاقوں کے بیابانوں کی طرف دھکیل رہے تھے۔ اس کے بیٹے ماتاکوم (METACOM) نے اس حالت میں یہ اندازہ لگایا کہ اگر اس نے جلد ہی آس پاس کے تمام انڈین قبائل کو ایک پرچم تلے جمع کر کے نو آباد کاروں کو روکنے کی کوشش نہ کی تو اس علاقہ کے تمام انڈین لوگ مکمل طور پر تباہ ہو جائیں گے۔ حالانکہ اس مقام پر نیو انگلینڈ کے انگریزوں نے ماتا کوم کو پاکانوکیت PAKANOKET انڈین کے سردار کی حیثیت میں خوشامد کی غرض سے بادشاہ فلپ کا خطاب دے کر خوش کرنے کی کوشش کی مگر اس نے نارا گانیست اور علاقہ کے دوسرے قبیلوں سے وفاق قائم کر کے مزاحمت کرنے کے عزم کو جاری رکھا۔

1675ء میں نو آبادکاروں کی طرف سے بار بار اشتعال انگیزی کے بعد بادشاہ فلپ نے انڈین قبائل کو بچانے کی کوشش میں اپنی تمام تر وفاقی قوت کو جنگ میں جھونک دیا۔ ابتدا کے طور پر انڈین لوگوں نے نو آبادکاروں کی باون بستیوں کو نشانہ بنایا جن میں بارہ بستیوں کا مکمل صفایا کر دیا۔ لیکن مہینوں کی لام بندی کے دوران نو آبادکاروں کے برتر بارودی اسلحہ نے وانپا نوگ اور ناراگانیست قبیلوں کا مکمل صفایا کر دیا۔ چیف ماتا کوم یا بادشاہ فلپ میدان جنگ میں کام آیا اور پھر اس کے سر کو کاٹ کر اور پلے متھ کے مقام پر ایک کھمبے سے لٹکا کر کوئی بیس سال تک اس کی تشہیر کی گئی۔ نیز اس کے بیوی بچوں کو دوسرے قید ہونے والے انڈین کے ساتھ جزائر غرب الہند میں غلاموں کے طور پر بیچ دیا گیا۔

جب ولندیزی نو آبادکار مین ہیٹن MAN HATTAN کے جزیرے پر اترے تو پیٹر مینوئیت نے اسے چند ٹکوں اور منکوں کے عوض خرید لیا مگر انڈین لوگوں کو وہیں رہنے دیا تاکہ ان کی قیمتی دست کاری اور دوسری اشیاء کو کوڑیوں کے بھاؤ خرید کر منافع کمایا جا سکے۔ 1641ء میں ولیم کیفت نے موہیکن MOHICAN انڈین پر بھاری ٹیکس لگا دئے اور پھر اپنے سپاہیوں کو سٹیٹن کے جزیرے STATAN ISLAN پر انڈین لوگوں کو ایک ایسے جرم کی پاداش میں سزا دینے کے لئے بھیجا جو حقیقت میں نو آبادکاروں سے سرزد ہوا تھا۔

انڈین نے جھوٹے الزام کے خلاف سپاہیوں کی مزاحمت کی اور چار انڈین ہلاک کر دیئے گئے۔ جب انڈین لوگوں نے جوابی کاروائی کر کے چار ولندیزی سپاہیوں کو ہلاک کر دیا تو کیفت نے انڈین لوگوں کے پورے دو گاؤں کے لوگوں کا قتل عام کرنے کا حکم دیا۔ ولندیزی سپاہیوں نے رات میں سوتے ہوئے انڈین پر حملہ آور ہو کر مرد، عورتوں اور بچوں کے جسموں میں پہلے سنگینیں اتاریں اور ان کے جسموں کے ٹکڑے کر کے بستیوں کو آگ لگا دی۔

آنے والی اگلی دو صدیوں تک یورپی نو آبادکاروں نے الیگھینی ALLEGHENY پہاڑی سلسلہ عبور کر کے جیسے جیسے مغرب کے اندرونی علاقوں میں دریائے میسی سپی MISSISSIPI اور میسوری MISSOURI کی وادیوں کی طرف پیش قدمی جاری رکھی ویسے ویسے انڈین لوگوں کے یہ وحشتناک قتل عام جاری رہے۔ ایرا کوئیز IRA QUIS لوگوں کی پانچ مشہور قومیں جو مشرقی شاخ کے قبائل میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور طاقت ور تھیں ایک طویل عرصہ تک گورے لوگوں کے ساتھ پرامن مراسم قائم رکھنے کی سرتوڑ کوشش کرتی رہیں۔ مگر سب بے سود گیا کیونکہ یورپی نو آبادکاروں نے تو حیلے بہانوں کے ذریعہ جنگ کو جاری رکھنے کا تہیہ کر رکھا تھا تاکہ اس کی آڑ میں انڈین لوگوں کی کل زمین پر قبضہ جمایا جا سکے۔ اور پھر ہوا بھی یہ ہی۔ برسوں کے خون خرابے کے بعد گورے نو آبادکاروں کے جدید اسلحہ کے سامنے انڈین لوگ اپنی سیاسی اور سماجی آزادی قائم رکھنے میں ناکام ہو گئے۔ اور ان میں سے بیشتر شکست کھانے کے بعد کچھ شمال کی طرف پسپا ہو کر کینیڈا کی طرف نکل گئے اور کچھ مغرب کی طرف نقل مکانی کر گئے اور جو باقی بچے انہیں ریزرویشن RESERVATION میں مقید کر دیا گیا۔

1760ء میں اوٹاوہ قبیلے کے سردار پونٹیاک CHIEF PONTIAC OF OTTAWA نے عظیم جھیل THE GREAT LAKE کے علاقہ میں دیگر انڈین قبائل کو اکٹھا کر کے وفاق قائم کرنے کی کوشش کی تاکہ انگریزوں کو الیگھینی کے دروں سے پار واپس دھکیلا جا سکتا مگر وہ بھی ناکام رہا۔ مگر اس کی سب سے بڑی سیاسی غلطی یہ تھی کہ اس نے انگریزی بولنے والے نو آبادکاروں کے خلاف فرانسیسی بولنے والے نو آباد کاروں کے ساتھ اتحاد کیا جنھوں نے ڈیٹروئیٹ کے انتہائی DETROIT اہم محاصرے میں انڈین کو دھوکا دے دیا۔

ایک اور نسل گزر جانے کے بعد شانی قبیلے کے سردار تکومسے TECUMSEH CHIEF نے وسطی مغربی اور جنوبی قبائل کے ساتھ مل کر ایک عظیم وفاق کو جنم دیا تاکہ

رہی سہی انڈین سرزمین اور اس کے باشندوں کو ایک انتہائی سفاک سنگدل اور وحشی گوری قوم کی یلغاروں سے بچایا جا سکتا۔ مگر 1812ء میں تکومسے کے میدان جنگ میں کام آ جانے کے بعد انڈین لوگوں کی آزادی کا یہ خیال بھی پورا نہ ہو سکا۔

1795ء اور 1840ء کے درمیانی اوقات میں میامی قبائل MIAMI نے جنگ کے بعد جنگ لڑی اور ایک کے بعد ایک امن کا معاہدہ کیا جن کی رو سے زرخیز اوہایو OHIO کی زمیں آہستہ آہستہ ان کے ہاتھ سے کھسک کر گورے نو آبادکاریوں کے قبضہ مین جاتی رہی یہاں تک کہ پھر کھونے کے لئے ان کے پاس کچھ بھی باقی نہ رہا۔

1829ء میں اینڈریو جیکسن ANDREW JACKSON جسے انڈین لوگ تیز خنجر کے نام سے پکارتے تھے امریکہ کا صدر بنا۔ اس شخص نے سرحدی مہمون کے دوران ہزاروں انڈین لوگوں کا بے دریغ قتل عام کیا تھا جن میں چروکی CHEEROKEE چیکسا CHICKSAW چوکتا CHOCTAW کریک CREEK اور سیمنول SEMINOLE اور دیگر انڈین لوگ شامل تھے۔ مگر اس سب کچھ کے باوجود یہ جنوبی انڈین اب بھی خاصی تعداد میں نہ صرف زندہ تھے بلکہ بڑی ڈھٹائی کے ساتھ اپنی دھرتی کے ساتھ چپکے ہوئے تھے جو گورے نو آبادکار لوگوں کے ساتھ بے شمار جنگ و امن کے معاہدہ کی رو سے ابھی ہمیشہ کے لئے ان کی تھی۔ مگر اینڈرو جیکسن نے کانگریس کے نام اپنے پہلے صدارتی خطاب میں یہ سفارش کی کہ تمام انڈین کو دریائے میسی سپی کے پار دھکیل دیا جائے۔

غرضیکہ کرسٹوفر کولمبس کے سان سلواڈور کے ساحل پر قدم رکھنے کو اب تین سو سال ہونے کو تھے اور انگریز نو آباد کاروں کے ورجینیا کے ساحل پر قدم رکھنے اور نیو انگلینڈ بسانے کو بھی اب کوئی دو سال بیتنے کو تھے اس دوران وہ مثالی میزبان انڈین قبائل جنہوں نے ایک دن مسکراتے چہروں کے ساتھ کولمبس کا پرتپاک استقبال کیا تھا وہ اور ان کی آنے والی نسلوں کو پوری طرح تہس نہس کیا جا چکا تھا۔

آخری تینو TAINO انڈین کے رخصت ہونے سے بہت پہلے ہی ان کی سادہ فطری زراعت اور قابل قدر دستکاری کو تباہ کر کے کپاس کے کھیتوں میں منتقل کر دیا گیا تھا جسے آباد کرنے کے لئے اب وہ افریقہ سے پکڑ کر لائے ہوئے شیدی غلاموں کی محنت سے آباد کرتے تھے۔ گورے نو آباد کاروں نے اس علاقہ کے فطری ٹروپیکل جنگلات کو صاف کر کے اپنے کپاس کی پلانٹیشن کو اور وسیع کر لیا تھا اور پھر جلد ہی کپاس کی فصلوں نے زمین کی زرخیزی کو نچوڑ لیا۔ تیز ساحلی ہوائیں جن کو اب تک قدرتی جنگلات نے روکے رکھا تھا

اب پھیل کر پورے علاقہ میں صحرائی ریت بکھیر کر اسے بنجر بنا دیا تھا۔ اتفاق سے یہ وہی زمین تھی جس کے بارے میں کولمبس نے کہا تھا۔

"زمین بہت وسیع اور ہموار ہے اور درخت انتہائی ہریالے سرزمین اتنی ہریالی کہ آنکھوں کو خیرہ کئے دیتی ہے۔"

مگر وحشی یورپی نو آبادکاروں نے جو کولمبس کے نقش قدم پر چل کر لاکھوں کی تعداد میں انڈین سرزمین پر ٹڈی دل کی طرح نازل ہوئے انہوں نے قدرتی آبادیوں کو مکمل طور پر برباد کر دیا۔ یہاں تک کہ انسان' جانور' پرندے' مچھلیاں کچھ بھی تو ان کی دست برد سے نہ بچ سکا۔ اور پھر ان جزائر کو دشت و بیاباں میں منتقل کر کے نئی زمینوں کی تلاش اور فتوحات کے لئے وہ شمالی اور جنوبی امریکہ کی طرف نکل گئے۔

عظیم چروکی انڈین لوگ گورے نو آباد کاروں کی طرف سے تھوپی ہوئی جنگوں' بیماریوں اور شراب نوشی کے خلاف کوئی ایک سو سال نبرد آزما رہنے کے باوجود ابھی زندہ تھے۔ مگر اب ان کا وقت بھی آن پہنچا تھا۔ کیونکہ ان کے علاقہ میں اپلاچی پہاڑوں (Appalachian Mts) میں سونے کی دریافت کے بعد گورے نو آباد کاروں نے اس علاقہ پر پوری قوت سے دھاوا بول دیا تھا۔ نتیجہ کے طور پر چروکی لوگوں کا خروج شروع ہو گیا اور 1838ء کے خزاں کے وقت جنرل وین فیلڈ سکوٹ GEN WINFIELD SCOTT کے سپاہیوں نے بچے کھچے انڈین کو گھیر کر ریزرویشن میں بند کر دیا۔

1848ء میں کیلفورنیا میں سونے کی دریافت ہوئی۔ اب تک یہ علاقہ میکسیکو کا حصہ تھا۔ چند ماہ کے اندر اندر ہزاروں کی تعداد میں راتوں رات امیر بن جانے کے خواب دیکھنے والے قسمت کے سپاہیوں نے انڈین علاقہ کے قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اسے عبور کرنا شروع کر دیا۔ وہ انڈین جو سانٹافی SANTA FE اور یگون ٹریل OREGON TRAIL کے نزدیک رہتے تھے انہوں نے ویگنوں کی طویل قطاریں دیکھیں جو گورے نو آباد کاروں سے بھری تھیں۔ ان میں سے بیشتر کا رخ کیلفورنیا اور اس کے سونے کی طرف تھا۔ مگر ان میں کچھ ایسے بھی تھے جو نیو میکسیکو اور اوریگون کے اندرونی علاقوں کی طرف گھوم گئے۔ انڈین لوگوں کے مستقل ٹھکانوں کی کھلم کھلا خلاف ورزیوں کو امریکی سرکار نے ان کا مقدر گردان کر اسے جائز قرار دے دیا۔ جس کا مطلب تھا کہ گورے نو آباد کار اور ان کی اولاد کو ہی پورے امریکہ پر حکومت کرنے کا حق تھا۔ انڈین لوگ' ان کی زمین' جنگلات اور معدنی دولت اب ان کی میراث تھی۔

1850ء میں انہوں نے مادوک MODOC موہاوَ MOHAVE پیوتے PAIUTE شاشتہ SHASHTA یوما YOMA و دیگر سینکڑوں چھوٹے قبائل کو جو بحر اوقیانوس کے ساحل کے ساتھ ساتھ پھیلے پڑے تھے گھیر لیا اور اس کے ساتھ ہی کیلفورنیا کے علاقہ کو میکسیکو سے چھین کر اکتیسویں ریاست کے طور پر امریکی وفاق میں زبردستی شامل کر لیا۔

اس زمانہ میں مغرب کا سب سے بڑا اور طاقتور قبیلہ سوں SIOUX یا ڈکوٹا DAKOTA انڈین کا تھا جو کئی شاخوں میں بٹا ہوا تھا۔ سانتی سوں SANTEE SIOUX مینسوتا MINNESOTA کے جنگلوں میں رہتے تھے اور برسوں سے مشرق کی طرف سے یلغار اور نو آبادکاروں کی پیش قدمی کے بموجب پسپا ہوتے جا رہے تھے۔ اس وقت ٹل کرو CHIEF LITTLE CROW نے قوی ارادے کے ساتھ ان یلغاروں کو روکنے کی کوشش کی مگر بے سود رہا۔ اس علاقہ کے مغرب میں جہاں عظیم میدان تھے ان میں ٹیٹن سوں TETON SIOU رہتے تھے جنہیں شاہسوار انڈین بھی کہا جاتا تھا جو اب تک مکمل طریقہ پر آزاد تھے۔ مگر سب سے زیادہ اور حوصلہ مند اور جنگجو جن کو اپنے علاقہ کی آزادی کے دفاع پر بہت ناز تھا وہ تھے اوگلالہ ٹیٹن OGLALA TETON_

جب گورے نو آباد کاروں نے پہلے پہل سوں انڈین کے خلاف اعلان جنگ کیا تو ان کا نامور سردار ریڈ کلاوڈ CHIEF RED CLOUD تھا۔ اس جنگ کی ابتداء میں جس سردار نے خدا داد جنگجوانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا وہ تھا جواں سال اور ہونہار سردار کریزی ہارس CHIEF CRAZY HORSE جو ابھی جنگ باز کہلوانے کے لئے بہت کم عمر تھا۔ مگر اس واقعہ کے سولہ سال بعد سردار کریزی ہارس اور اس کے یتیم دوست گال GALL نے مل کر امریکی فوج کے خلاف ایک ایسا تاریخی کارنامہ انجام دیا جو امریکہ کی ملٹری ہسٹری یا فوجی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ اور وہ یہ کہ 1876ء میں ونڈیڈنی WOUNDED KNEE کے میدان جنگ میں اوگلالہ سردار کریزی ہارس نے محض تلواروں' تیر کمانوں اور دشمن سے چھینے ہوئے ہتھیاروں سے لیس ہو کر جنرل کسٹر کی کمان میں ایک بھاری اسلحہ سے لیس امریکی حملہ آور ڈیوِژن کو گھیر کر اس کا مکمل صفایا کر دیا اور جنرل کسٹر سمیت اس کی حملہ آور فوج کا ایک بھی سپاہی زندہ نہ بچا۔

جیسا کہ ہوتا آیا تھا جنگ ہار جانے کے بعد نو آباد کار ہمیشہ صلاح اور امن معاہدے کی درخواست کرتے اور جب تک ان کو ضرورت ہوتی امن قائم رکھتے اور پھر تیاری کر کے نئے سرے سے جنگ یا دھوکا دہی سے میدان جیت لیتے۔ غرضیکہ میدان جنگ میں انڈین

لوگوں نے شاید ہی کوئی جنگ ہاری ہو مگر صلاح اور امن کی آڑ میں دھوکا دہی کی سیاست کے ذریعہ گورے لوگوں نے یہ تمام جنگیں جیتیں۔ غالبًا انڈین لوگوں کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ نہ تو جھوٹ بولنا جانتے تھے اور نہ ہی الفاظ دے کر ان سے مکرنا جانتے تھے۔ جبکہ یورپی گورے جھوٹ' دھوکا دہی' فریب اور سنگدلی میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔

غرضیکہ سردار کریزی ہارس کے ہاتھوں شرمناک شکست کھا جانے کے بعد گورے نو آباد کاروں نے امن معاہدے کی اپیل کی۔ اور انڈین جو زندہ رہنا چاہتے تھے انہوں نے کبھی بھی کسی امن معاہدے کے امکانات کو کھو دینے کی کوشش نہیں کی۔ لہٰذا سادہ لوح' بانکا اور حسین سردار کریزی ہارس معاہدے پر دستخط کرنے کے لئے نہتا گورے کیمپ میں آیا تو انہوں نے پیچھے سے حملہ کر کے اس کی پیٹھ میں سنگین گھونپ کر اسے ہلاک کر دیا۔ یہی حال کولوراڈو COLORADO اور کینساس KANSAS کے میدانوں میں رہنے والے چینی CHEYENNE انڈین کا بھی ہوا۔

1860ء تک نیبراسکا NEBERASKA کے پہاڑوں میں رہنے والے کیووا KIOWA انڈین فرار ہو رہے تھے۔ اور یہی حشر ان کے اتحادی کومانچی COMANCHE انڈین کا بھی ہوا۔ حالانکہ ان کے سردار ستتالون وولف SATANTA LONE WOLF اور کیکینگ برڈ KICKING BIRD نے میدان جنگ میں اپنا لوہا خوب منوایا۔

سردار ٹین بیر CHIEF TEN BEAR اب بہت بوڑھا ہو چکا تھا اور اب شاعر زیادہ تھا اور جنگجو سردار کم۔ مگر قونغ QUANAH جو ابھی بیس سال کا بھی نہیں تھا بیفلو رینجز BUFFALO RANGES کے پہاڑوں میں اپنے لوگوں کو بچانے کی خاطر آخری معرکہ آرائی میں ڈٹا ہوا تھا۔

جنوب مغرب کے بیابانی میدانوں میں اپاچی انڈین APPACHE INDIAN تھے جو ہسپانوی نو آبادکاروں کے خلاف کم سے کم ڈھائی سو سال سے معرکہ آرائی یا جنگیں کرتے چلے آ رہے تھے اور جنہوں نے اس طویل عرصہ میں ہسپانوئیوں کے ہاتھوں نت نئے ظلم و استبداد اور ایذا رسانی کے حربے سہے تھے مگر نہ کبھی شکست قبول کی تھی اور نہ ہی ان کے صلاح اور امن معاہدوں کی چال میں آئے تھے۔ گو ان کی تعداد نسبتاً تھوڑی تھی مگر وہ اپنی بنجر اور کرخت زمین کی طرح سخت گیر لڑاکے تھے جن کی جنگجویانہ شہرت کی دھاک دور دور تک بیٹھ چکی تھی۔

نواحو NAVAHO گو کہ اپاچی انڈین ہی کی ایک شاخ تھی مگر انہوں نے ہسپانوی نو آبادکاروں کے ساتھ مصالحت کر لی تھی اور اب بھیڑ بکریاں چرانے اور پھل فروٹ اگانے میں لگے تھے۔ مگر اب ریاست ہائے متحدہ کی فوجوں نے نیو میکسیکو اور اریزونا ARIZONA کے علاقہ میں ان کو بھی آن گھیرا تھا۔

اپاچی اور نواحو انڈین کے شمال میں روکی پہاڑوں ROCKIES کے یوتے UTEH انڈین تھے اور ان کا سردار اورے OURAY تھا جس نے گورے نو آباد کاروں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے پڑوسی انڈین لوگوں کے خلاف فوج کشی کا راستہ اختیار کر لیا تھا۔ ان کے مغرب بعید میں چھوٹے چھوٹے بیشتر انڈین قبیلے تھے جو آپس کے جھگڑوں میں الجھنے کی وجہ سے کمزور تھے۔ مگر ان میں مادوک MODOC کا ایک قبیلہ بہت منفرد تھا جس نے اپنے سردار کنت پاش کی قیادت میں گرانڈ کینین GRAND CANYION کے علاقہ میں نو آبادکار فوج کا ناطقہ بند کر دیا تھا۔

مادوک انڈین کے شمال مغرب میں نیز پرس یا نتھ پہننے والے انڈین تھے جو 1805ء تک گورے نو آبادکار پڑوسیوں کے ساتھ پرامن زندگی گزارتے آئے تھے۔ مگر 1855ء تک وہ سب بھی بلیو ماونٹین MLUE MOUNTAIN اور یگون اور زہریلی جڑی بوٹیوں والے اداھو IDAHO کے درمیان ریزرویشن کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیئے گئے تھے۔ ان کا بھی ایمان تھا کہ گورے اور انڈین دونوں ہی کے لئے زمین بہت تھی۔ مگر یہی ان کی سب سے بڑی غلطی تھی کیونکہ وہ یورپی نو آباد کاروں کی زمین کے بھوک سے واقف نہ تھے۔ جس کی انہیں بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ آخرکار 1877ء میں ہینموٹ تویالاکیت HEINMOT TOOYALAKET جسے بعد میں گورے لوگ چیف جوزف بھی کہتے تھے اس کو جنگ و امن کے درمیان قسمت ساز فیصلہ کرنا پڑا۔

نیوادا NEVADA کے وسیع میدانوں میں پیوتے PAIUTE چیف واوکا WOVOKA کی قیادت میں آخری معرکہ کے طور پر اکٹھے ہوئے اور ختم ہو گئے۔

اگلے کوئی تیس سالوں میں ان انڈین اور ان کے کئی سرداروں نے زندگی اور موت کے درمیان آخری کشمکش کے طور پر امریکہ کی تاریخ اور لوک کتھاؤں میں اپنے لئے اعلیٰ مقام حاصل کیا۔ 1890ء میں انہوں نے زخمی گھٹنے کی جنگ OF WOUNDED KNEE BATTLE کے میدان میں جانبازی اور جاں نثاری کے لئے اتنا ہی بڑا نام پیدا کیا جتنا ان کو تباہ کرنے والوں نے پایا تھا اور اب کوئی ایک صدی کے بعد ایک ایسی دنیا میں جہاں

سورماؤں HEROES کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی وہ شاید امریکی سرزمین کے آخری اور امر سورما تھے اوگلاس سردار ریڈ گلاوڈ نے خلاصہ کے طور پر ایک دفعہ کہا تھا۔

"گورے لوگوں نے ہم سے اتنے وعدے کئے تھے کہ ان کو یاد رکھنا ممکن نہیں مگر انہوں نے ہم سے صرف ایک وعدہ وفا کیا اور وہ یہ کہ انہوں نے ہم سے ہماری زمین چھین لینے کا وعدہ کیا جو پورا کیا۔"

مختصراً" یورپی نو آباد کاروں کا وہ خواب جسے اب امریکہ کہا جاتا ہے اس سرزمین کے قدیم باشندوں کی کھوپڑیوں سے تعمیر کیا گیا۔ جیسا میں نے پہلے کہا آدمی کی یادداشتیں بہت سطحی ہوتی ہیں اور عام انسان اپنے ذاتی اور قریبی مفادات سے آگے سوچنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ گو امریکہ آج سب سے بڑا جمہوری ملک کہلاتا ہے اور حقوق انسانی کا سب سے بڑا علمبردار بھی۔ مگر آج بھی اس کی مسلح افواج کیوبا' نکاراگوا' گرنیادا اور پانامہ جیسے چھوٹے چھوٹے ملکوں پر مضحکہ خیز حیلے بہانوں کے ذریعہ یوں چڑھ دوڑتی ہیں جس طرح ایک دن امریکہ کے طول و عرض پر آباد انڈین قبائل اور ان کی بستیوں پر صدیوں چڑھ دوڑتی رہیں تھیں۔ اگر فطرت کے نظام میں دیر ہے اور اندھیر نہیں تو قدرت امریکہ نام کے اس سفید ہاتھی سے انتقام ضرور لے گی جو دھرتی کے انتہائی پس ماندہ اور کچلے ہوئے عوام کو بے دریغ روندتا چلا جا رہا ہے۔

میں نے 1987ء کے موسم بہار میں مانٹریال (کینیڈا) کے موہاک MOHAWK انڈین کی ایک ریزرویشن کا گاناواکی KAHNA WAKE کا دورہ کیا۔ جب میری ملاقات چیف اینڈریو ڈیلزلے CHIEF ANDREW DELISLE سے ہوئی۔ تو انہوں نے مجھے بتلایا کہ گورے لوگوں کے ہاتھوں انڈین لوگوں پر ظلم و ستم جوں کا توں جاری ہے اور یہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ امریکہ اور کینیڈا کی سرزمین پر ایک بھی انڈین زندہ ہے۔" چیف نے مزید بتلایا کہ۔ "چند دہائی قبل کاناواکی ریزرویشن اٹھائیس مربع میل پر پھیلی ہوئی تھی مگر اب سکڑ کر چار ۔ٹ پانچ مربع میل رہ گئی ہے۔ بقیہ علاقہ پر گورے لوگوں نے اور ان کی انتظامیہ نے زبردستی قبضہ کر لیا ہے۔ حقیقت میں اس ریزرویشن کے لوگ اب اپنے خاتمے کے خلاف نو آباد کار دور کی طرح اپنی آخری جنگ میں مصروف ہیں۔ 1794ء کے امن معاہدے کی رو سے یہ علاقہ موہاک انڈین کا خود مختار علاقہ تھا جس پر امریکی یا کینیڈا کی حکومت کو ان کے دستور کے مطابق کوئی حق نہ تھا۔ مگر اب انڈین لوگوں پر ٹیکس لگائے جا رہے ہیں۔ ان میں شراب اور منشیات کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے۔ اس طرح ٹوٹے

چھوٹے گھرانے اور معاشرہ ہمارا مقدر بنا دیا گیا ہے۔

"غرضیکہ گوری دنیا جو صدیوں سے ہمیں گھیرے ہوئے ہے۔ رات اور دن ہمارے خلاف سازش اور فتنہ گری میں مصروف رہتی ہے اور یہ شاید اس وقت تک ہوتا رہے گا جب تک کہ ایک بھی انڈین زندہ ہے۔ کیونکہ انڈین لوگ گوری تہذیب کو اس کی وحشت ناک تاریخ اور بنیادوں کا آئنہ دکھلاتے ہیں جس میں انہیں اپنا اصل اور بدنما چہرہ نظر آتا ہے۔ بدقسمتی سے بنی نوع انسان کا ضمیر ہمارے بارے میں کبھی بھی نہیں جاگا اور اگر کبھی جاگا بھی تو شاید اس وقت جب اس سرزمین پر جو ہزاروں سالوں سے ہمارے اجداد کی حسین اور فطری میراث تھی اس پر انڈین لوگوں کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے گا۔ کیا نسل پرستی اور نسلی تعصب کی اس سے بڑی مثال مل سکتی ہے۔ مگر ہم ایک دن اپنے اجداد کی خاک اور اپنی راکھ سے مر کر بھی پھر سے زندہ ہوں گے۔"

فسطائیت کا چہرہ

فسطائیت کا ظہور کئی ایک صورتوں میں ہوتا ہے۔ مگر قبیلہ پرستی، جاگیردارانہ قوم پرستی، نسلی و لسانی شاونیت، سرمایہ دارانہ سامراجیت و مذہبی جنونیت اور ترقی پذیر ممالک میں وفاقی فوجی آمریت، اس کی نشوونما کے محبوب میدان ہوتے ہیں۔ گو اسے چنگاری دکھانے اور پھر ہوا دینے کا عمل معاشی و سماجی قوتوں کے نام پر ہی ہوتا ہے، مگر موقع پرست سیاسی لٹیرے راہنما اپنے مخصوص مفادات کی خاطر، تنگ نظر قوم پرستی کا ایک ایسا جال بچھاتے ہیں جس میں موجودہ سماج کے نسلی، ثقافتی، لسانی اور اقتصادی تضادات کا بھرپور استعمال ہوتا ہے اور جس کی قیمت اصل میں عوام الناس کو ادا کرنی پڑتی ہے۔

انقلاب سے قبل کے چین میں چانگ کائی شیک کی جاگیردارانہ قوم پرستی اور اس صدی کی تیس کی دہائی کے آخر میں ہٹلر کی نازی عسکری قوم پرستی، اس ضمن میں کلاسیک مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ جرمن نازیوں نے آریہ سماج کی نسلی برتری کے نعروں کے تحت لاکھوں بے گناہ یہودیوں، جپسیوں اور مشرقی یورپ کی دیگر نسلی اقلیتوں کے لوگوں کا سفاکانہ قتل عام اس پیمانہ پر کیا، جس کی مثال انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔

میں نے یہ سب کچھ بھول جانا چاہا۔ میں نے اپنے 1947ء کے منقسم ہندوستانی ماضی اور پھر 1971ء کے پاکستانی ماضی کو بھلا دینے کی بھی بہت کوشش کی۔ مگر بچپن کی لاشعور یادوں کا بھلا کیا کیجئے جو پل جھپکتے میں میرے ذہن کو 1947ء کے دہلی ریلوے سٹیشن پر لے جاتی ہیں۔ جہاں پلیٹ فارم سینکڑوں انسانی لاشوں سے پٹا پڑا تھا۔ وہ ٹھنڈی، اندھیری اور برستی رات کتنی بھیانک تھی! فضا میں گلی سڑی لاشوں سے پھوٹتی موت کی بدبو ہر طرف پھیلی تھی، جس کے گھناؤنے تصور سے اب بھی مجھے متلی ہونے لگتی ہے۔

پاکستان کی طرف دوڑتی ہوئی ریل گاڑی کی کھڑکی کے ساتھ بیٹھے، میں نے کرک شیترا کے نزدیک آزادی کے اس سورج کو قریب سے ابھرتے دیکھا تھا۔ ریل کی پٹڑی کے ساتھ لاشیں یوں پڑی تھیں جیسے وہ اس سفر کے سنگ میل ہوں۔ یہ ان بدقسمت لوگوں کی لاشیں تھیں جو اپنے خوابوں کی منزل تک نہیں پہنچ پائے تھے اور میں جو اس نئی منزل تک پہنچا،

وہ ان سے بھی زیادہ بد قسمت نکلا- پھر اس ناگہانی سفر کے نقطہ عروج کے طور پر جب گاڑی پنجاب کے ایک لوک کتھائی شہر پر رکی تو مجھے یوں لگا جیسے میں جاگتے میں خواب دیکھ رہا ہوں- پلیٹ فارم سے محض چند گز پرے میدان میں پڑی ایک انسانی لاش کے اکڑے ہوئے گھٹنے کو بڑے آرام سے ایک کتا کھا رہا تھا- میں یہ سب کچھ بھلا کیسے بھول سکتا ہوں!

میں 1971ء کے مشرقی پاکستان کے واقعات کی یاد دلا کر آپ کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا' یہ کام میں کسی اور حساس صاحب فکر پر چھوڑتا ہوں- مگر پھر بھی میری یادوں کی بارات غیر ارادی طور پر ان بنگالی دوستوں کو بھلا دینے کو تیار نہیں جن کا پیار بھرا ساتھ میرے ذہن پر یادوں کے انمٹ نشان چھوڑ گیا-

کچھ لوگ اکثر پوچھتے ہیں کہ میں اپنے گھناؤنے ماضی کے ساتھ کیوں چمٹا رہتا ہوں؟ اس کے جواب کے طور پر میں صرف یہ کہہ پاتا ہوں کہ "وہ جو اپنا ماضی بھلا دیتے ہیں' انہیں اس کی اذیتوں سے ایک بار پھر گزرنا پڑتا ہے-" شاید ہندوستان کے شرنارتھی اور پاکستان کے مہاجر' مجھ سے کچھ اتفاق کریں-

میں نے ایک بار نہایت ہی احمقانہ طور پر یہ سوال ہنگری کی اپنی منہ بولی بہن فرانسسکہ سے کر دیا' کیوں کہ اس وقت مجھے پوری طرح اس بات کا احساس نہیں تھا کہ یہودی' جپسی اور مشرقی یورپ کے لوگ نازیوں کے ہاتھوں کتنی اذیت ناک بربریت کا شکار ہوئے تھے-

میرے اس بچگانہ سوال سے گویا آتش فشاں پھٹ پڑا اور مجھے یوں لگا جیسے میں اس کے بہتے ہوئے لاوے تلے دب جاؤں گا- اب وہ ابلتا لاوا میرے ذہن پر بوجھ بن کر میرے ضمیر کو جلاتا رہتا ہے- میں نے اپنے ضمیر کے اس بوجھ میں آپ کو شریک کر کے اسے کچھ ہلکا کرنے کی کوشش کی ہے- ایک عرصہ سے میں نے ایک قدیم دراوڑ کی طرح شکستی کے ذریعہ جارحیت کا مقابلہ قوت برداشت سے کرنے کی کوشش کی ہے- اور یہ کہ معاف کر کے بھول جانے کو اصل انسانی اوصاف سے تعبیر کیا ہے- مگر بہن فرانسسکہ کے جواب کے بعد اب یہ الفاظ میرے ضمیر کو جلا کر خاکستر کئے دیتے ہیں- بہن فرانسسکہ نے اپنے جواب کی ابتدا فرانز فینن کے ان الفاظ سے کی-

"میں گیا وقت ہوں' کل' عالم میں جاگ کر' میں نے آسمان کو
کلی طور پر الٹ کر' اپنے آپ پر گرتے دیکھا- میں نے کھڑا ہونا چاہا'
مگر چاک شکم خامشی اپنے مفلوج پروں کے ساتھ' پھر سے مجھ پر آن
گری- بے پرواہی' خم ٹھوک کر کھڑی لاشعیت اور حد بے پایاں'

میں رونے لگا....."

"میں ایک صدی کی نسل ہوں' خاموشیاں' قید بندیاں' پھانسیاں' بے وفائیاں' امتیازی علیحدگیاں' بھوک و جلا وطنی ..... اور ہمیشہ انسانی حرمت کی تذلیل موت کے سائے سے لوٹ کر اپنے تاریخی کردار کی اداکاری۔ دغا محض چٹری اور دل ہی کے ساتھ نہ تھا' پر جیت عقل کی رہی ..... میں ایک ہیبت ناک سچائی کا بچہ۔ سچائی کیا ہے؟ تم پوچھو: ہم یقیناً جانتے ہیں کہ جھوٹ اور فریب کیا ہے۔"

"یہ صبح صادق کا وقت ہے اور نازی مزاحمت کرنے والوں کو صرف آرا کرتے ہیں۔ میرا باپ ان میں شامل ہے۔ مدمقابل ہاتھوں میں رائفل اٹھائے جلاد کھڑے ہیں اور میرا چھوٹا بھائی ان میں شامل ہے۔ وہ اپنی رائفل اٹھاتا ہے اور پھر اس تشدد کے ساتھ نیچے لاتا ہے کہ اس کے زوردار دھماکے سے وہ گھناؤنا منظر پارہ پارہ ہو جاتا ہے اور پھر وہ بھی میرے باپ کے ساتھ جا ملتا ہے۔ میرے ذہن کے تمام تصورات میں یہ سب سے زیادہ وحشیانہ تصور ہے۔

"میں گیا وقت ہوں۔ میرے بھائی' میں یہ سب کچھ تمہیں کیوں بتلا رہی ہوں؟ کیونکہ وہ منظر اب بھی جاری ہے۔ جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی۔ میں نے مرنے والوں کی قسم کھائی تھی کہ دل کی خاموشی کو یادیں بنا کر' ان کے خوفناک دکھوں کو اپنے پاس رکھوں گی' کیونکہ ایسے لوگوں کی موت کو بھولنا اور معاف کرنا تو بہت ہی بڑی قیمت ادا کرنے کے مترادف ہے۔

"میرے اچھے بھائی' بہتر ہے کہ آئندہ تم یہ سب کچھ یاد رکھو۔ تم مجھے نفرت' فرض' وقار' پاک دامنی اور موت کے بارے میں بتلانا چاہتے ہو!؟"

"یہ کوئی اقرار نامہ نہیں ہے اور نہ ہی فضول کی زبان درازی' بلکہ یہ تو انسان اور سچائی کے ساتھ ڈھٹائی سے چپکی "میں" ہوں' جس کے بغیر دنیا ایک بے معنی خلاء بن کر رہ جاتی ہے۔ دشمن کو ابھی مات نہیں ہوئی' عقل و ادراک کے عمل کے رکتے ہی لمبے بوٹ اپنی پیش قدمی جاری رکھتے ہیں۔ لہٰذا سچائی کو بھی اسی شدت کے ساتھ قائم رہنا چاہئے تاکہ تشدد' فریب اور انسانی تذلیل کا خاتمہ ہو۔ دنیا اب بھی خیالات کی بجائے ہتھیاروں پر اکتفا کرتی ہے۔ لیکن گولیوں کی بوچھاڑ سے مسخ کئے جانے والے خاموش چہروں پر اب بھی بلا کا حوصلہ باقی ہے۔ سچائی کا چہرہ ابھی پوری طرح مسخ نہیں ہوا۔ گو بالآخر ضد اور مزاحمت کا پیدا ہونا موسم بہار کی طرح یقینی ہے۔

"میں گیا وقت ہوں ..... ناامیدی کے پینڈورا کے صندوق میں بند' میں امید کی کرن ہوں۔ غصہ بھری نہیں' نہ ہی نفرت آمیز' بلکہ قہر و غضب بھری صدائے بازگشت اور تمہیں ان کے فرق کو پہچاننا چاہئے۔

"ایسے ہی ناگفتہ بہ حالات میں ایک دفعہ' ایک جاپانی اعلیٰ ذات کی عورت نے ایک پنچ ذات کے آدمی سے شادی کر لی۔ جس پر اونچی ذات والے اتنے برہم ہوئے کہ اس حاملہ عورت کو زندہ جلا دیا' تاکہ اس خاندان کو ایک پنچ ذات کے بچہ کی پیدائش کے داغ سے بچایا جا سکے۔ اس آدمی نے اپنی عورت اور بچہ کی حفاظت میں ناکامی کے بعد خودکشی کر لی۔ مگر موت کا منہ چوم لینے سے پہلے اس نے مندرجہ ذیل سطور لکھیں جنہیں میں دنیا کے تمام موجودہ آریہ سماجیوں کی نذر کرتی ہوں۔"

"میرے بچے کو غضب ناک آگ میں جلا دو' ان سب سے اس
وقت تک نفرت کرو جب تک کہ یہ درد سے نڈھال' گھٹنے ٹیکے
تمہارے سامنے' معافی مانگنے نہ آئیں' مگر پھر بھی تم انہیں کبھی
معاف نہ کرنا' کبھی نہیں ....."

باپ کے نام آخری خط

پردیس کی وحشتوں اور چور- ڈاکوؤں کے مسکن میں، تم ہمیں تنہا چھوڑ کر بالاخر چلے ہی گئے- مگر میں تمہاری جدائی پر ماتم نہیں کروں گا، کیونکہ موت تو ہماری درد بھری اجاڑ زندگیوں میں ایک ایسی ابدی نیند کی طرح آتی ہے، جو آنے والی زندگی کی کرشتگیوں سے ہمیشہ کے لئے نجات دلا سکے- اسی لئے تو تم موت سے کبھی نہیں گھبرائے اور نہ ہی آسمانی سہارے ڈھونڈنے کی بے جاہ کوشش کی- تم ایک دکھ بھری طویل مگر بامقصد اور باعمل زندگی گزار کر آخری دم تک رواں دواں، چپکے سے شہر خموشاں کو یوں سدھار گئے جیسے تھک ہار کر انسان کوئی دم آرام کرنے کو جاتا ہے-

اس گھناونے جاگیرداری سماج میں پروان چڑھنے کے باوجود زندگی پر تمہارا ایمان کتنا پختہ تھا! اور اپنی چھتر سالہ ذاتی جدوجہد میں شاید یہ پہلا موقع تھا جب تمہیں حقیقت میں آرام نصیب ہوا-

کاش میں تمہاری ڈائری تمہاری روانگی سے قبل پڑھ لیتا- تو میں تمہیں بہتر طور پر سمجھ سکتا تھا، اور ہم دونوں ہی کتنے پشیمان کن لمحات سے بچ سکتے تھے! اور یہ کہ تم نے مجھ کو بچپن میں کبھی گود میں اس لئے نہیں اٹھایا تھا، کہ تم خود بھی تو بچپن ہی میں باپ کے سائے سے محروم ہو گئے تھے- اور اب یہ بھی پتہ چلا کہ زندگی نے ابتدا ہی سے ایک خوفناک گدھ کی طرح تمہارے تمام پر نوچ ڈالے تھے- جوانی میں بیوہ ہو جانے کے باوجود تمہاری بہادر ماں نے راجپوتانہ کی تپتی دھرتی پر "ستی" یا زندہ درگور ہو جانے کی بجائے صحرائی بیابانوں میں خانہ بدوشوں کی سی تڑپ کے ساتھ جاگیردار بھیڑیوں کے بیچ تمہیں پروان چڑھایا تھا- اور تم نے بھی اپنی خوددار ماں کی طرح اپنے پیچھے چھوڑے ہوئے جاگیردارانہ اثاثے کی طرف کبھی لوٹ کر نہیں دیکھا-

ہاں، اب یہ راز کھلا کہ تم میری تعلیم کے بارے میں اتنے سنجیدہ کیوں تھے- کیونکہ تمہیں خود بھی اسکول جانا نصیب نہیں ہوا تھا- ایک نامور چوہان گھرانے میں پیدا ہونے کے باوجود، محض زندہ رہنے کے لئے تمہیں بھیڑ بکریاں چرانی پڑی تھیں اور تمہاری بنیاد کے اسی

ورثہ پر مجھے سب سے زیادہ فخر بھی ہے۔ شاید اسی لئے میں نے بھی عمر بھر بھیڑ بکریاں چرانے کے خواب تو دیکھے ہیں، مگر گھٹن زدہ جاگیردار سماج کے ساتھ مصالحت کرنے پر میں کبھی راضی نہیں ہوا۔

پاکستان میں پینتالیس برس تک جلا وطنوں کی سی زندگی بتا کر جب میں گاؤں واپس آیا تو تمہارے بھولے بسرے دنوں کے ایک ساتھی "جگ لعل جاٹ نے بھیگی آنکھوں کے ساتھ تمہارا ذکر کیا۔ جب تم صحرائی ٹیلوں کی چوٹی پر تنہا بیٹھ کر، چاندنی راتوں میں بانسری بجاتے اور گاتے، تمہاری درد بھری آواز کتنی مدھر تھی۔ تمہارے راگ میں یاس بھری کتنی تڑپ تھی۔ پھر تم جواں عمری ہی میں زندگی سے انتقام لینے کے لئے انگریزوں کی گھوڑ سوار فوج میں بھرتی ہو گئے۔ مغلوں کی طرح انگریزوں کو بھی تمہارے صدیوں پرانے شاہسواری اور سپاہ گری کے خاندانی پیشہ کی خوب قدر تھی اور تم دا پونا ہارس رجمنٹ میں اپنے خاندانی اسکوڈرن میں جا شامل ہوئے۔ جہاں دوسری عالمی جنگ کے دوران، عراق، فلسطین، مصر اور شمالی افریقہ کے محاذوں پر تم جرمن نازیوں کے خلاف صف آراء ہوئے۔

جب میرے ننھے ذہن نے پہلے پہل یادوں کو محفوظ کرنا سیکھا، تو آج بھی دھندلا سا یاد پڑتا ہے کہ تم کئی سالوں کے بعد محاذ سے واپس لوٹے تھے۔ تم نے ہرے رنگ کی بہت خوبصورت وردی زیب تن کی ہوئی تھی۔ اور تمہارے سامان کے طور پر دو بہت خوبصورت گھوڑے بھی تھے، جو ایک سیاہ تھا اور دوسرا سفید۔ آس پاس کے مارو لوگ تمہاری تجیلی وردی اور ولایتی گھوڑوں کو دیکھنے کے لئے دور دور سے آئے تھے۔ تمہارے سڈول کندھوں پر سفید دھاگے سے بنے دو ستارے بھی جڑے تھے جو میرے ذہن کے کونوں میں کبھی کبھی اب بھی چمکتے ہیں۔

تمہاری ڈائری کے مطابق تم نے "آل انڈیا کیولری گھوڑ دوڑ مراتھون" کے مقابلہ میں اپنے استاد درجن سنگھ کے بعد دوسرا درجہ حاصل کیا تھا۔ تب تم ملٹری اکیڈمی دہرادون میں شاہسواری کے استاد بھی مقرر ہوئے۔ تم نے فرض شناسی، خود داری، ڈسپلن، اور منصفانہ سخت گیر قیادت کے لئے اپنے حریفوں سے بھی لوہا منوایا۔ تم نے عمر بھر جانفشانی کے ساتھ جدوجہد کی اور اپنے آئیڈیل کے لئے آخری دم تک برسرپیکار رہے۔

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ کاش تم مجھے، بیٹے کی بجائے دوست سمجھتے۔ اپنے اندر کے خامشی میں سلگتے احساسات کو مجھ پر آشکارا کر کے دل کا بوجھ ہلکا کرتے۔ مگر نہیں، تم اپنے جذبات کو ہمیشہ اندر ہی اندر برف کی مانند منجمد رکھتے۔ میں جانتا ہوں کہ اطراف کی دنیا کتنی

بے حس، سنگدل اور خود غرض تھی اور جاگیردارانہ ماحول کے ورثہ کے طور پر اب بھی ہے، مگر پھر بھی تم نے مجھے صحیح طور نہ پہچان کر غلطی کی تھی۔ مگر تمہاری سب سے بڑی غلطی 1947ء میں پاکستان چلے آنے کا فیصلہ تھا، جس کی سزا ہم ابھی تک بھگت رہے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب تم نے یہ قسمت ساز فیصلہ کیا تو ہم جھانسی چھاؤنی میں تھے۔ کیا تمہیں یاد ہے کہ میں نے اپنے بچگانہ پن میں رو کر اپنے ریگستانی گاؤں اور گھر کو لوٹ جانے کی رٹ لگائی تھی۔ مگر تم نے کہا تھا کہ "ہم ایک مسلم ملک کو ہجرت کر رہے ہیں، جو عین سنت ہے۔"

مجھے یاد ہے، اس کے جواب میں بچوں کی طرح چڑ کر میں نے کہا تھا کہ "سنت ہو یا فرض، پر ایسا فیصلہ جو لوگوں کو گھربار چھوڑنے پر مجبور کرے وہ صحیح نہیں ہے۔" اس کے بعد بدقسمتی سے ہمارے سوچ کی راہیں ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئیں۔ اور میں اپنے ماضی کو اپنے انگ سے کبھی خارج نہیں کر سکا اور نہ ہی نئی دنیا مجھے کسی بھی صورت راس آئی۔ گو کچھ تاخیر سے مگر تاریخ نے بھی بالآخر یہ فیصلہ کر دیا کہ برصغیر کی تقسیم آنے والی نسلوں کے لئے کتنی تباہ کن تھی۔ مگر اب ایک طویل عرصہ کے لئے سب کشتیاں جل چکی تھیں اور واپس لوٹ جانے کی سب راہیں مسدود کر دی گئی تھیں۔

ہم گمشدہ بچوں کی طرح اجنبیت کے انجانے خوف کو دل میں چھپائے، غیر تحفظ کے احساس اور قومی تذلیل کو سینے میں دبائے اور خانہ بدوشوں کی طرح تحقیر کا طوق گلے میں لٹکائے، دیس بدیس اور در در کی ٹھوکریں کھاتے پھرے۔ میں تمہیں اس کا کلی دوش نہیں دیتا کہ تم خود بچوں کی طرح معصوم تھے، مگر جس دشمن نے دیدہ دانستہ ہمارے گھر اجاڑے، ہمیں بھٹکنے پر مجبور کیا، میں اس دشمن کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔

ستم ظریفی یہ کہ ہم ہزاروں میل کا چکر لگا کر سندھ چلے آئے جس کی سرحدیں اپنے ماضی کے دیس راجستھان سے ملتی تھیں۔ یعنی لاشعوری طور پر اپنی سرحد پر آن پڑے، مگر چند میل کا یہ فاصلہ پار کرنا اب ہم پر ہمیشہ کے لئے حرام قرار پایا۔ ہمارے ماضی اور حال کے بیچ ایک ایسی فصیل کھڑی کر دی گئی جو وقت کے ساتھ بوسیدہ ہو جانے کی بجائے اونچی اور مضبوط ہوتی چلی گئی۔

سندھ میں تم نے چھ ایکڑ زمین الاٹ کروائی، جتنی تم پیچھے چھوڑ کر آئے تھے۔ اس تکلف کی بھی بھلا کیا ضرورت پڑی تھی۔ میں ان کا ذکر نہیں کرنا چاہتا جنھوں نے جھونپڑیوں سے نکل کر محل آباد کئے اور محل چھوڑ کر جھونپڑیوں کے لئے ترستے رہے۔ مگر ہم جو

سمندر کی طرح پھیلے ہوئے وسیع ریگستان میں عقاب کی طرح تاحد نگاہ نظر رکھتے تھے' وہ شمال مغرب کی تنگ و تاریک گھاٹیوں اور دریائی طاس کے تاریک جنگلوں میں خود سر مقید ہونے کو کیوں تیار ہوئے۔ ظاہر ہے میری درد بھری پکار کا جواب اب تم کبھی نہیں دے پاؤ گے۔ تمہیں تمہاری منزل مل گئی' مگر یہ منزل وہاں بھی تو مل سکتی تھی' جہاں ہمارے اجداد کی ہڈیاں ہزاروں سال سے دفن تھیں۔

اس پر سونے پہ سہاگہ یہ کہ پاکستان میں تم نے مجھے بھی فوج میں شامل ہونے پر مجبور کیا۔ حالانکہ فوجی بارکیں مجھے ہمیشہ جیل کی بارکوں کا احساس دلاتی تھیں۔ مگر تمہاری منشا کا احترام ضروری تھا۔ حسن اتفاق' 1958ء میں جب میں ملٹری اکیڈمی کاکول سے کمیشن حاصل کرکے کیولری فوج میں افسر بنا تو اسی سال تم اپنی سروس سے ریٹائر ہو گئے۔ جب تم ریٹائر ہوئے تو کمانڈر انچیف فیلڈ مارشل ایوب خان کے اعزازی اے۔ ڈی۔ سی' بھی تھے۔ مگر اپنے رتبے سے ذاتی فائدہ لینا تمہارا شیوا نہیں تھا۔ اس طرح ایک عمر تیاگ کر اور بڑھاپے کی دہلیز پر پہنچ کر تم خالی ہاتھ گھر لوٹ آئے۔ وہ گھر جو حقیقت میں کبھی بھی میرا گھر نہ بن سکا۔

یہ وہ دن تھے جب ماں کو سرطان کی بیماری نے آ دبوچا۔ وہ جینا چاہتی تھی مگر پردیس میں پاؤں رگڑ رگڑ کر مرنا اس کا مقدر ٹھیرا۔ جب تم سدھارے تو میں موجود نہیں تھا اچھا ہی ہوا' میں نے تمہارے چہرے پر ہمیشہ زندگی کو ناچتے دیکھا تھا اور اب آخری وقت میں موت کی پژمردہ' لکیریں دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ میں قبروں کا بھی قائل نہیں' مگر تمہیں آخری سلام کرنے قبرستان گیا تو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ تم ماں کے پہلو میں جا سوئے تھے۔ دو دہائیوں کے بعد ماں کی قبر پر اب بھی ایک تختی لگی تھی' فاطمہ عمر 45 سال' زندگی میں نہ سہی پر ابدی نیند میں دھرتی ماں تم دونوں کو خوش رکھے۔ تمہارے نئے اسلامی ملک کی میرے دل میں اب اس سے زیادہ اور کوئی حقیقت نہیں' کہ تم دونو اجڑ کر یہاں دفن ہوئے۔

جب تم فوج سے واپس لوٹے تو سندھ میں تم نے اپنی چھ ایکڑ کی جاگیر پر سندھڑی آموں کا ایک باغ لگایا اور یوں زندگی کی نئی ابتدا کی اور یہ شاید پہلا موقع تھا جب تمہیں اپنی محنت کا پھل کھانا نصیب ہوا۔ مگر فوج کے مسئلہ پر ہمارا سمجھوتا نہیں ہو سکتا تھا۔ تم نے فوج میں رہ کر میرے لئے بھی پیشہ ورانہ خواب دیکھے تھے' مگر میں ان کو پورا کرنے کا اہل نہیں تھا۔ کیونکہ میں جس فوج میں شامل ہوا' وہ کم سے کم وہ فوج نہیں تھی جو تم نے

چھوڑی تھی۔ میرا فوجی بپتسما ایوب خان کے مارشل لاء کے ساتھ ہوا تھا جو اب نہ ہی تو نو آبادیاتی تھی اور نہ ہی قومی، بلکہ اب یہ جدید نو آبادیاتی فوج تھی، جس کا کام ملک کے نظریاتی دفاع کی آڑ میں ذاتی لوٹ کھسوٹ اور مغربی سامراج کے مفادات کی حفاظت کرنا تھا۔ میں تمہیں کیسے سمجھاتا کہ ایوب کے مارشل لاء نے ملک کی جمہوری اقدار کی بنیادوں پر حملہ کیا تھا، اور یہ کہ یحییٰ خان کے مارشل لاء نے دو قومی نظریات کی آڑ میں بنگلہ دیش بنا کر تین مسلم قوموں کو جنم دے دیا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ سقوط ڈھاکہ تاریخ میں کسی بھی مسلمان فوج کی بدترین شکست تھی۔ مجھے فوج کی اس قسم کی منفی سیاسی سرگرمیوں کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

لہٰذا مجھے فخر ہے کہ میں نے سقوط ڈھاکہ سے ایک سال قبل 1970ء میں اپنا استعفیٰ جنرل نیازی کو یہ کہہ کر پیش کر دیا کہ "جو فوج اپنے ہی ہم وطنوں سے برسرپیکار ہے، میں مزید اس کا حصہ بنے رہنے کو تیار نہیں۔" مگر نام نہاد ٹائیگر، جنرل امیر عبداللہ خان نیازی نے یہ شرط رکھی کہ اگر میں اپنی پنشن سے ہاتھ دھونے پر تیار ہوں تو میرا استعفیٰ منظور کیا جا سکتا ہے۔ میں اس قسم کے کم ظرف افسروں کے ساتھ مصالحت کرنے کی بجائے اپنی چودہ سال آٹھ مہینے کی پنشن سے دستبردار ہو کر خالی ہاتھ گھر لوٹ آیا۔ اس لئے مجھے کوئی تعجب نہیں ہوا، جب اس کاغذی شیر نے اس واقع کے محض ایک سال بعد نہایت شرمناک اور ذلت آمیز طور پر جنرل اروڑہ کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ مگر ہتھیار ڈالنے سے پہلے یہ فوج نہ صرف تیس لاکھ بنگالی مسلمانوں کے قتل عام کی مرتکب ہوئی تھی، بلکہ دو لاکھ مسلمان بہنوں کی عزت سے بھی کھیل کر آئی تھی۔ مگر پاکستان کی جاگیردار حکومت اور اس کی فوج نے اس قومی المیے کے بعد ڈکار تک نہیں لی، بلکہ "حمود الرحمٰن رپورٹ" طرز کی سرکاری رپورٹ تک نہ چھپنے دی۔

مگر تمہارا تو سیاست سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا اور تم جدید نو آبادیاتی فوج کے سیاسی عزائم اور باریک نقاط کو نہیں سمجھ سکتے تھے۔ اسی لئے تم نے مجھے فوج چھوڑنے کی پاداش میں کبھی معاف نہیں کیا۔ کیونکہ تم میری نئی زندگی کی غربت و افلاس کا احساس تو کر سکتے تھے، مگر میری نئی آزادی کی امنگوں اور خوشیوں میں شریک نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ خوشیاں ایسی تھیں جس کی قدر یا تو لاابالی طور پر پھرتے ہوئے خانہ بدوش کر سکتے ہیں اور یا پھر قفس سے فرار ہونے والا آکاش میں اڑتا آزاد پنچھی۔ اسی لئے تو میں نے پھر کبھی گھر نہیں بنایا اور نہ ہی تمہارے بنائے ہوئے گھر کو آباد کرنے کے لئے تیار ہوا اب ہم بہت

دور نکل چکے تھے۔

مگر مجھے احساس تھا کہ میری معاشرتی بغاوت اور خانہ بدوشی تم پر گراں گزرتی ہے۔ اور قبیلے کے دوسرے لوگ بھی مجھے خاندان کی کالی بھیڑ تصور کرتے ہیں۔ لہٰذا میں نے یہ ملک چھوڑ کر سمندروں پار چلے جانے کا فیصلہ کیا۔ 6 مارچ 1987ء کو میں نے جہاز پر سوار ہونا تھا۔ مگر فرانز کفکا FRANZ KAFKA کے باپ کی طرح تم بھی محض میرے سہارے ہی زندہ تھے' اور جیسا کہ مجھے اس حرکت سے باز رکھنے کے لئے تم مجھ سے صرف ایک دن پہلے اس جہان فانی سے ہی کوچ کر گئے۔ موت اور زیست کے اس آخری کھیل میں بھی تم بازی لے گئے۔ اب جب تم ابدی میٹھی نیند سو رہے ہو' میں اس سنگدل دنیا میں تمہارے چھوڑے ہوئے ورثے کے بوجھ تلے دبا اپنے زخم چاٹ رہا ہوں۔

سندھ کے ایک چھوٹے سے قصبہ ٹنڈواللہ یار میں ایک وفاقی وزیر' ایک ایروائس مارشل اور ایک لیفٹیننٹ جنرل تمہیں آخری سلامی دینے موجود تھے۔ تمہاری آخری رجمنٹ نے رسمی سلامی کے ساتھ' مہکتے پھولوں کی سیج تلے تمہیں رخصت کیا۔

ایک صدی کے جیالے سپوت کی طرح ایک چرواہے کی ڈگر سے اٹھ کر' ایک سورما سپاہی کے آخری خواب تک تم نے ایک بھرپور زندگی گزاری اور مجھے تم پر فخر ہے۔ گو تمہاری خاندانی ریت کے عین بموجب نہ صرف یہ کہ تمہارا ایک بیٹا آج بھی جنرل ہے' بلکہ تمہاری تیسری نسل بھی ٹینک اور لڑاکے ہوائی جہاز کمان کرتی ہے۔ مگر میں' تمہارے ورثے کے محض نفیس اور اصولی پہلوؤں کی حفاظت کروں گا۔ میرے لئے تمہارا رسیلے آموں کا باغ' تمہارے جیالے بھیل کسان اور تمہارا گوٹھ کپتان است علی آج بھی انمول اثاثہ ہے۔

آخر میں یہ کہہ کر اجازت چاہتا ہوں کہ تم نے عمر بھر ایک تناور شاہی بلوط کے درخت کی طرح طوفانوں کا سامنا کیا' جسے تیز آندھیوں میں ہر وقت ٹوٹ جانے کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔ مگر میں گھاس کی ان نرم و نازک پتیوں کی طرح زندہ ہوں' جو تیز ہواؤں کے سامنے جھک تو جاتی ہیں مگر ٹوٹتی کبھی نہیں۔

پڙهندڙ نسُل . پ ن

The Reading Generation

1960 جي ڏهاڪي ۾ عبدالله حسين ” اُداس نسلين“ نالي ڪتاب لکيو. 70 واري ڏهاڪي ۾ وري ماڻِڪَ ”لُڙهندڙ نَسُل“ نالي ڪتاب لکي پنهنجي دورَ جي عڪاسي ڪرڻ جي ڪوشش ڪئي. امداد حُسينيءَ وري 70 واري ڏهاڪي ۾ئي لکيو:

انڌي ماءُ ڄڻيندي آهي اونڌا سونڌا ٻارَ
ايندڙ نسل سَمورو هوندو گونگا ٻوڙا ٻارَ

هر دور جي نوجوانن کي اُداس، لُڙهندڙ، ڪَڙهندڙ، ڪُڙهندڙ، ٻَرندڙ، ڇُرندڙ، ڪِرَندڙ، اوسيئڙو ڪَندڙُ، ياڙي، ڪاٺو، ياڄوڪَڙُ، ڪاوڙيل ۽ وِڙهندڙ نسلن سان منسوب ڪري سَگهجي ٿو، پَر اسان اِنهن سيني وِچان ”پڙهندڙ“ نسل جا ڳولائو آهيون. ڪتابن کي ڪاڳر تان ڪٽي ڪمپيوٽر جي دنيا ۾ آڻڻ، ٻين لفظن ۾ برقي ڪتاب يعني e-books ناهي ورهائڻ جي وسيلي پڙهندڙ نسل کي وَڌڻ، ويجهَڻ ۽ هِڪَ ٻِئي کي ڳولي سَهڪاري تحريڪ جي رستي تي آڻِڻَ جي آسَ رکون ٿا.

پَڙهندڙ نَسل (پَـنَ) ڪا بہ تنظيمَ ناهي. اُنَ جو ڪـو بہ صدر، عُهديدار يا پايو وِجهندڙ نہ آهي. جيڪڏهن ڪو بہ شخص اهڙي دعوىٰ ڪري ٿـو تہ پَڪَ ڄاڻو تہ اُهو ڪُوڙو آهي. نہ ئي وري پَنَ جي نالي ڪي پئسا گَڏ ڪيا ويندا. جيڪڏهن ڪو اهڙي ڪوشش ڪري ٿو تہ پَڪَ ڄاڻو تہ اُهو بہ ڪُوڙو آهي.
جَهڙيءَ طَرَح وڻـن جا پَنَ ساوا، ڳاڙها، نيرا، پيلا يا ناسي هوندا آهن اَهڙيءَ طرح پَڙهندڙ نَسُل وارا پَـنَ بہ مختَلِف آهـن ۽ هوندا. اُهي ساڳِئي ئي وقت اُداس ۽ پڙهندڙ، پَرنـدڙ ۽ پڙهنـدڙ، سُست ۽ پڙهنـدڙ يا وِڙهندڙ ۽ پڙهنـدڙ بہ ٿـي سگهن ٿا. ٻيـن لفظن ۾ پَنَ ڪا خُصوصيِ ۽ تالي لڳل ڪِلَب Exclusive Club نہ آهي.
ڪوشش اها هوندي تہ پَـنَ جا سڀ ڪَم ڪار سَهڪاري ۽ رَضاڪار بنيادن تي ٿين، پر ممڪن آهي تہ ڪي ڪم اُجرتي بنيادن تـي بہ ٿِيـن. اهڙي حالت ۾ پَـنَ پاڻ هِڪَٻِئي جي مدد ڪَـرڻ جـي اُصـولَ هيـٺ ڏي وَٺُ ڪنـدا ۽ غيرتجـارتي non-commercial رهنـدا. پَنَـن پـاران ڪتـابن ڪـي ڊِجيٽـائِيز digitize ڪرڻ جي عَملَ مان ڪـو بہ مالي فائدو يا نفعو حاصل ڪـرڻ جي ڪوشش نہ ڪئي ويندي.
ڪتابن ڪي ڊِجيٽائِيز ڪرڻ کان پـو ٻيـو اهـم مرحلو وِرهائڻ distribution جو ٿيندو. اِهو ڪم ڪرڻ وارن مان جيڪـڏهن ڪـو پيسا ڪمائي سگهي ٿو تہ ڀلي ڪمائي، رُڳو پَنَـن سان اُن جو ڪو بہ لاڳاپو نہ هوندو.

پَنَن کي کُليل اکرن ۾ صلاح ڏجي ٿي تہ هو وَسَ پٽاندڙ وڏِ
کان وَڏِ ڪتاب خريد ڪَري ڪتابن جي ليکَڪَن، ڇپائيندڙن ۽
ڇاپيندڙن کي هِمٿائِن. پر ساڳِئي وقت عِلم حاصل ڪرڻ ۽ ڄاڻ
کي ڦهلائڻ جي ڪوشش دوران ڪَنهن بہ رُڪاوٽ کي نہ مڃن.
شيخ اَيازَ علمَ، ڄاڻَ، سمجهہَ ۽ ڏاهپَ کي گيتَ، بيتَ، سِٽَ،
پُڪارَ سان تَشبيهہ ڏيندي انهن سيني کي بَمن، گولين ۽ بارودَ
جي مدِ مقابل بيهاريو آهي. اياز چوي ٿو تہ:
گيتَ بہِ ڄڻ گوريلا آهن، جي ويريءَ تي وار ڪَرن ٿا.
... ...
جئن جئن جاڙ وڌي ٿي جَڳَ ۾، هو ٻوليءَ جي آڙ ڇُپن ٿا؛
ريتيءَ تي راتاها ڪن ٿا، موتي مَنجهہِ پهاڙ ڇُپن ٿا؛
... ...
ڪالهہَ هُيا جي سُرخ گُلن جيئن، اڄڪلهہ نيلا پيلا آهن؛
گيتَ بہِ ڄڻ گوريلا آهن........
... ...
هي بيتُ اَٿي، هي بَم- گولو،
جيڪي بہ ڪٽين، جيڪي بہ ڪٽين!
مون لاءِ ٻنهي ۾ فَرَقُ نہ آ، هي بيتُ بہ بَمَ جو ساٿي آ،
جنهن رِڻَ ۾ رات ڪَيا راڙا، تنهن هَڏَ ۽ چَمَ جو ساٿي آ -
اِن حسابَ سان اٽڃاٽائي کي پاڻَ تي اِهو سوچي مَڙهڻ تہ
”هاڻي ويڙهہ ۽ عمل جو دور آهي، اُن ڪري پڙهڻ تي وقت نہ
وڃايو“ ناداني‌ءَ جي نشاني آهي.

پَنَن جو پڙھڻ عام ڪِتابي ڪيڙن وانگر رُڳو نِصابي ڪتابن تائين محدود نہ ھوندو. رڳو نصابي ڪتابن ۾ پاڻ کي قيد ڪري ڇڏڻ سان سماج ۽ سماجي حالتن تان نظر ڪڄي ويندي ۽ نتيجي طور سماجي ۽ حڪومتي پاليسيون policies اٽڃاڻن ۽ نادانن جي ھٿن ۾ رھنديون. پَنَ نِصابي ڪتابن سان گڏوگڏ ادبي، تاريخي، سياسي، سماجي، اقتصادي، سائنسي ۽ ٻين ڪتابن کي پڙھي سماجي حالتن کي بھتر بنائڻ جي ڪوشش ڪندا.

پَڙھندڙ نَسُل جا پَنَ سيني کي **چو، ڇالاءِ ۽ ڪيئن** جھڙن سوالن کي ھر بَيانَ تي لاڳو ڪرڻ جي ڪوشش ڏين ٿا ۽ انھن تي ويچار ڪرڻ سان گڏ جوابَ ڳولڻ کي نہ رڳو پنھنجو حق، پر فرض ۽ اٽُر گھرج unavoidable necessity سمجھندي ڪتابن کي پاڻ پڙھڻ ۽ وڌ کان وڌ ماڻھن تائين پھچائڻ جي ڪوشش جديد ترين طريقن وسيلي ڪرڻ جو ويچار رکن ٿا.

توھان بہ پڙھڻ، پڙھائڻ ۽ ڦھلائڻ جي اِن سھڪاري تحريڪ ۾ شامل ٿي سگھو ٿا، بَس پنھنجي اوسي پاسي ۾ ڏِسو، ھر قسم جا ڳاڙھا توڙي نيرا، ساوا توڙي پيلا پن ضرور نظر اچي ويندا.

وڻ وڻ کي مون ياڪِي پائي چيو تہ ”منھنجا ياءُ
پھتو منھنجي من ۾ تنھنجي پَنَ پَنَ جو پڙلاءُ“.
۔ اياز (ڪلھي پاتم ڪينرو)